مقاصد الاسلام

حصۂ اوّل

تالیف

حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر محمد انوار اللہ فاروقی

فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز، بانی جامعہ نظامیہ

مطبوعات مجلس اشاعۃ العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد ۵۰۰۲۶۴ (آے پی) الہند

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام

از افاداتِ سراپا برکات حقائق آگاہ معارف دستگاہ عارف باللہ شیخ الاسلام
مولانا الحاج خان بہادر حافظ **محمد انوار اللہ فاروقی** قدس سرہ العزیز
المخاطب نواب فضیلت جنگ سابق معین المہام امورِ مذہبی سرکارِ عالی
بانیِ جامعہ نظامیہ

مقاصد الاسلام

حصۂ اوّل

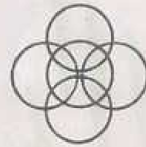


حسب الحکم میر مجلس اشاعۃ العلوم
فضیلت مآب حضرت مولانا الحاج سید حبیب اللہ قادری صاحب (رشید پادشاہ)
بہ اہتمام: مولانا الحاج محمد خواجہ شریف صاحب معتمد مجلس اشاعۃ العلوم و شیخ الادب جامعہ نظامیہ

طبعِ ثالث (عکسی) ◎ تعداد : دو ہزار

مطبع : انٹرنیشنل آفسیٹ پرنٹنگ پریس کنگ کوٹھی حیدرآباد

جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ مطابق ڈسمبر ۱۹۹۰ء



ناشر

مجلسِ اشاعۃ العلوم

پتہ

دفترِ اشاعۃ العلوم جامعہ نظامیہ

حیدرآباد ۵۰۰۲۶۴ اے پی (الہند)

فون: ۵۲۱۷۷۲

قیمت :

ایمان اور تمدن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

امّا بعد یہ امر پوشیدہ نہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی آدمیوں کی طبیعت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مثل حیوانات کے جنگل میں تنہا اقامت نہیں کرسکتے بلکہ چند ابنائے جنس ملکر ایک بستی آباد کرلیتے ہیں مگر چونکہ طبائع مختلف ہوتے ہیں اور اکثر طبیعتوں میں خودغرضی تکبر اور ظلم و تعدی ہوا کرتی ہے اسوجہ سے تمدن اکثر خطرناک حالت میں رہا کیا جسکی اصلاح کے لئے حکما نے بھی قواعد ایجاد کئے اور انبیائے سابق بھی اوسکے متعلق کچھ نہ کچھ احکام سُنایا کئے مگر جب ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپنے اس طور پر تمدن کی اصلاح فرمائی کہ اگر اوسپر عمل کیا جائے تو تمام بندگان خدا ہر شہر و قریہ میں نہایت آسایش سے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اگرچہ اسلامی کتابیں مسائل تمدن سے بھری ہوئی ہیں مگر ہر شخص اونپر مطلع نہیں ہوسکتا اسلئے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر اسلامی تمدن کا کچھ حال لکھوں جس سے ناواقفین علم کو معلوم ہوجائے کہ ہمارے دین نے اس باب میں کیسے مستحکم اصول قائم کردیے ہیں کہ قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتے وما توفیقی الا باللہ

واضح رہے کہ پہلا قدم اصلاح تمدن میں ایمان ہے۔ یعنی اس بات کی تصدیق کہ خدای تعالیٰ ایک ہے اور اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بناکر اون پر قرآن نازل فرمایا جس میں ہمارے نفع ونقصان کے کل ابواب مذکور ہیں اگر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے اچھے کام کریں تو جنت کے مستحق ہونگے اور برے کام کریں تو دوزخ کا استحقاق ہوگا اور یہ دونوں گھر ہماری جزا وسزا کیلئے خالق عزوجل نے تیار کر رکھے ہیں۔

ایمان کا لفظ جو لکھا گیا دیکھنے کو تو بہت چھوٹا اور معمولی لفظ ہے جسکو ہر شخص جانتا ہے مگر اوسکے معنے ایسے وسیع ہیں کہ اگر اونکی تشریح کی جائے تو ایک مستقل رسالہ ہو جائیگا اور ایسے دقیق مباحث پیش ہو جائینگے کہ اونکا سمجھنا سمجھانا دشوار ہوگا اسلئے ہم یہاں صرف اوسکے لغوی معنے بیان کر دیتے ہیں جسکو ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ امن سے ماخوذ ہے اور اوسکے معنی امن دینے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ اصلاح تمدن کا مدار امن کے قایم رکھنے پر ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ خود لفظ ایمان سے ثابت ہے کہ اصلاح تمدن لوازم ایمان سے ہے یعنے جب ایمان کے معنے پورے طور پر متحقق ہو جائیں تو امن وامان کا تحقق ہوگا جس سے خود تمدن کی اصلاح ہو جائیگی مگر یہ بات بادی الراے میں سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ تمدن کی حقیقت نہ معلوم ہو اسلئے ہم پہلے اوسکو مختصر طور پر بیان کرتے ہین اگر اوس مین غور وتدبر سے کام لیا جائے تو امید کی جاتی ہے کہ اہل انصاف پر ہمارا دعوی مبرہن ہو جائیگا

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ آدمی کو جس قدر حاجتیں لگی ہوئی ہین اور کسی میں نہیں پائی جاتیں دیکھئے جب وہ اپنا تنگ وتاریک اور گرم مقام چھوڑ کر اس وسیع میدان عالم میں قدم رکھتا ہے تو بظاہر اوسکے تن برہنہ پر سرد ہوا کا صدمہ جسکو ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا تھا ایسی اذیت پہنچاتا ہے کہ بے اختیار رو دیتا ہے۔ کیونکہ مثل اور حیوانوں کے اوسکے جسم پر بال ہوتے ہی نہیں

جو پشمینی لباس کا کام دیں۔ اوسوقت کی حالت اوسکی قابل رحم اور عبرت خیز ہے کہ اس عالم مین آنے کی کشمکش سے اوسنے ہنوز دم نہین لیا تھا کہ اس عالم کی ہوا لگتے ہی ایک احتیاج اوسپر ایسی مسلط ہو گئی کہ اوسکو رولا کر چھوڑا پھر ایک مدت دراز تک نہ کہیں جا سکتا ہے نہ مثل حیوانون کے پھر سکتا ہے بستر ناتوانی پر پڑا ہوا بھوک اور پیاس کے صدموں سے رو رو کر گھڑی گھڑی اپنی حاجت کو بیان کرتا رہتا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب غذا بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اوسوقت بھی خود مختاری سے مثل جانوروں کے کوئی چیز کھا نہیں سکتا اور اگر کھا بھی لیا تو معدہ میں صلاحیت نہیں کہ مثل جانوروں کے گھاس وغیرہ کو ہضم کر سکے۔ پھر جب ہوش سنبھالتا ہے اور اپنی ذاتی سعی سے غذا حاصل کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے تو اوسکی غذائے طبعی ایسی نہیں جو جنگل یا افتادہ ہو اور ہر جگہ دستیاب ہو سکے جیسے حیوانات کیلئے مقرر ہے بلکہ ایسے غلوں کی طرف محتاج ہے جنکو خاص طور پر زراعت کر کے حاصل کرنیکی ضرورت ہے پھر اوسکی طبیعت ایسی نازک بنائی گئی کہ مثل حیوانات کے بے گھر گزران نہین کر سکتا اسلئے گھر کی طرف محتاج ہے پھر اندرونی اور بیرونی اسباب خدا جانے اوسپر کتنے مسلط ہین جنکی وجہ سے اس کثرت سے امراض اوسکو لاحق ہوتے ہیں جنکی پوری فہرست ابتک قلمبند نہ ہو سکی ہر وقت ایک نئی بیماری کا سامنا ہے اور ایک نئی دوا کی حاجت ممکن نہیں کہ مثل حیوانوں کے باقتضاے طبع اپنا علاج آپ کر سکے اب غور کیجئے کیا ممکن ہے کہ کوئی فرد بشر ان تمام ضروری اشیا کو اپنی ذاتی کوششوں سے فراہم کر سکے ہرگز نہیں۔ صرف غذا ہی کو دیکھ لیجئے جسکی ہر وقت ضرورت ہے کہ کس قدر دشواریوں میں رکھی گئی ہے کہ جب تک اپنی ذات سے زراعت نہ کرے کہیں مل نہیں سکتی بخلاف گھاس پتوں کے جو حیوانوں کی غذا ہے کہ باوجودیکہ ہر سال جانور چر کر اوسکو فنا کر دیتے ہیں مگر جب نیا سال آتا ہے تو

بغیر اسکے کہ کوئی جانور تخم ریزی کرے اور زراعت کی مشقت اُٹھائے خود بخود پیدا ہوئی ہے
اب زراعت کو دیکھئے کہ کتنی چیزوں کی طرف اوسمیں احتیاج ہوتی ہے ابتدائے ہل بنانیکی
ضرورت ہے جو بغیر لوہے اور لکڑی کے نہیں بن سکتا۔ پہر لوہے اور لکڑیکا حاصل کرنا
بہی آسان نہیں اوسکے لئے بہی آلات کی ضرورت ہے پہر وہ آلات بہی بغیر بنائے
بن نہین سکتے اونکا مادہ حاصل کرنا بہی محتاج آلات ہے غرضکہ صرف آلات ہی کا سلسلہ
ایک مدت دراز تک اوسکو پریشان کرر کہیگا پہر وہ آلات اگر بن بہی گئے اور غلہ حاصل ہو بہی گیا
تو بغیر پکائے کہانے کے لایق نہیں ہوتا کیونکہ اوسکے معدہ میں اتنی حرارت نہیں رکہی گئی
جو مثل حیوانات کے کچے غلہ کو پچا کر ہروقت ہضم کرسکے بلکہ اوسکے ہضم کیلئے یہاں تک بیرونی
مدد کی حاجت ہے کہ کئی چیزونکو پیسنے کی ضرورت ہے اسلئے ظروف وغیرہ کی احتیاج ہوئی
پہر اون ظروف کے بنانے مین بہی وہی دشواریاں درپیش ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مکان وغیرہ میں
جو ضرورتیں اور احتیاجیں لاحق ہوتی ہین محتاج بیان نہیں۔ بہرحال انسان کو اتنی کثیر التعداد اشیا
کی طرف احتیاج ہے کہ اونکی فہرست لکھنی مشکل ہے بڑے بڑے شہروں میں دیکھئے تو
ایک بڑا حصہ اونکا اونکی ضرورتوں کو پوری کرنے والی اشیاء سے بہرا نظر آئیگا۔

غرضکہ ضرورتوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے بداہتہً یہ ثابت ہوتا ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد بشر
اپنی ذاتی کوششوں سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ پہر بہت سی ضرورتیں اون میں ایسی
ہیں کہ جب تک وہ پوری نہوں بقاے شخصی اور بقاے نوعی محال ہے اسلئے ہر وقت
بہت سی چیزونکی طرف احتیاج لگی رہتی ہے۔ اور احتیاج ایسی بُری چیز ہے کہ جب تک
وہ رفع نہو بلائے بے درماں کی طرح آدمی پر مسلط رہتی ہے اور ہر وقت اوسی سے متعلق
خیال لگا رہتا ہے جس سے دوسرا کام تو کیا خیال تک نہیں آسکتا۔ دیکھ لیجئے کہ جب

آدمی کو بہوک کی وجہ سے غذا کی احتیاج ہوتی ہے تو وہ جہاں جاتا ہے غذا حاصل کرنے
ہی کا خیال لگا رہتا ہے بلکہ وہ خیال سوائے اوس مقام کے جہاں غذا حاصل ہوسکے
دوسری طرف اوسکو جانے نہیں دیتا۔ اگر اوسکے پاؤں میں زنجیر ڈالی جاتی تو ممکن تھا کہ کسی
تدبیر سے اوسکو توڑ کر کہیں چلا جاتا۔ مگر اس خیال کی ایسی گراں زنجیر اوسکے پاؤں میں پڑی
ہوئی ہے کہ کسی طرف وہ قدم نہیں اٹھا سکتا اسی پر اور حاجتوں کو قیاس کرلیجئے۔ ان حاجتوں
نے انسان کو اسقدر مجبور کردیا کہ ہر ایک شخص دوسرے سے بزبان حال کہہ رہا ہے کہ خدا
کیلئے مجھے بچالو ورنہ میں ہلاک ہوا جاتا ہوں۔ اس باہمی گفتگو اور احتیاج کا یہ اثر ہوا کہ
ہر ایک دوسرے کی ہمدردی پر آمادہ ہوگیا اور سب نے اتفاق کرلیا کہ ایک ایک حصہ زمین کا زراعت
وغیرہ ضروریات کیلئے اپنے تصرف میں لیکر چھوٹی بڑی بستیاں بحسب ضرورت آباد کریں چنانچہ
اس ہمدردی سے تمدن کی بنیاد پڑی اور ایک ایک کام کی طرف ایک ایک جماعت متوجہ
ہوگئی کسی نے لوہا زمین سے نکالنا اپنے ذمہ لیا۔ کسی نے اوسکے آلات بنانے کیطرف
توجہ کی کسی نے زراعت کا اہتمام کیا کسی نے لباس وغیرہ کا انتظام کیا۔ غرضکہ اپنی اپنی
مناسبت طبعی اور مصلحت وقت کے لحاظ سے ایک ایک کام اپنے اپنے ذمہ لیکر سب نے
مایحتاج اشیا کو ہاتھوں ہاتھ فراہم کردیا۔

ہر چند بظاہر یہ ابتدائی حالت کا نقشہ معلوم ہوتا ہے مگر حالت موجودہ پر غور کیا جاے تو ہر وقت
وہ اسی نقشہ کو پیش نظر کریگی۔ دیکھ لیجئے ذلیل سے ذلیل خدمت خاکروبوں کی ہے۔ اگر
وہ اتفاق کرکے اوس سے دست بردار ہوجائیں تو تمام شہر میں تہلکہ پڑ جائے اور قدر نعمت
بعد زوال کا مضمون پورے طور پر صادق آجائے۔

جب آپنے دیکھ لیا کہ آدمی بات بات میں محتاج ہے اور اسی احتیاج نے اسکو شہر بند

کر رکھا ہے اور جب تک قید حیات میں ہے اس دائمی حبس سے آزاد نہیں ہو سکتا تو اس
مشاہدہ کے بعد بھی اگر کوئی آزادی کا دعوی کرے تو کیونکر صحیح سمجھا جائیگا البتہ بہ نسبت
انسان کے حیوانات کسیقدر آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں کیونکہ اونکی حاجتیں محدود اور بہت
کم ہیں مگر اسی آزادی نے اونکو دولت تمدن سے محروم کر کے ایسی کس مپرسی حالت میں
ڈال رکھا ہے کہ اونکو مار بھی ڈالیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اب دیکھئے کہ کثرت احتیاج ہرچند نقص اور موجب نقص ہے مگر حق تعالی نے انسانکی
فطرت میں اوسکو داخل کر کے اپنے فضل و کرم سے اوسی نقص کو کمال کا سبب بنا دیا
جیسے کہ آزادی باوجودیکہ کمال ہے مگر آزادوں کو دیگر ایک نعمت عظمی سے اونکو ہمیشہ کیلئے
محروم رکھا اسلئے کہ ممکن نہیں کہ تمدن پر مجبور کرنے والی حاجتیں اون میں پیدا ہوں اور وہ اُس
نعمت تمدن کو حاصل کر سکیں اسکا ثبوت باسانی یوں ہو سکتا ہے کہ کسی وحشی جانور کو لاکر
نہایت لذیذ اور خوش گوار نعمتیں کھلائے اور فاخرہ لباس پہنائے اور عالیشان آراستہ مکان
میں رکھئے پھر اون تمام نعمتوں کا ذائقہ چکھانے کے بعد چھوڑ کر دیکھ لیجئے کہ اوسکو اون چیزوں
کیطرف احتیاج ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ تو مشاہدہ ہے کہ بندروں کو شہر میں لاکر پرورش
کرتے ہیں اور ایک مدت تک انسانوں کی حسن معاشرت کو وہ دیکھتے ہیں باوجود اسکے
جب چھوٹتے ہیں تو وہی اونکا ڈالی کودتا اور کچے پکے پھل کھا جاتا تمام دنیا کی نعمتوں
سے اونکے نزدیک افضل ہے نہ وہ روٹی پکا سکتے ہیں نہ اوسکی ضرورت ہوتی ہے۔
اگر اون میں تمدن کی صلاحیت ہوتی تو آدمیوں کے تمدن کو دیکھکر تو کوئی شہر آباد کئے ہوتے
اس مشاہدہ کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہوگا کہ بندر چونکہ بعض اعضا اور حرکات میں انسان کے
مشابہ ہیں اس وجہ سے آدمی اونکی نسل سے ہے اور صرف دُم جھڑ جانے کی وجہ سے اوسکو

امتیاز حاصل ہو گیا ہے جیسا کہ آج کل مذہب ڈاروین کے مسئلہ ارتقا پر زور دیا جا رہا ہے
ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ چند چیزوں میں مشارکت اور مشابہت ہونے
سے وحدت نوعی صادق نہیں آسکتی دیکھ لیجئے تمام جمادات نباتات حیوانات اس بات
میں شریک ہیں کہ سب کو جسم صورت شکل وغیرہ ہے باوجود اسکے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ
سب نوع واحد ہیں بلکہ وحدت نوعی اوسیوقت صادق آئیگی کہ صورت نوعیہ اور طبیعت
نوعیہ کئی افراد میں ایسے طور پر پائی جاوے کہ دیکھنے والا فی البدیہہ کہدے کہ وہ سب
ایک قسم کی چیزیں ہیں مثلاً جس قسم کا گھوڑا دیکھا جائے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا دیکھنے والا سب کو ایک
قسم میں داخل کر دیگا کیونکہ صورت نوعیہ سب کی ایک ہے گو صورت شخصیہ ہر ایک کی ممتاز ہو۔
اسیطرح جتنے لوازم اور آثار ہیں سب کے ایک قسم کے ہونگے جو طبیعت نوعیہ سے متعلق ہیں۔
اب دیکھئے کہ بندر اور انسان کی صورت نوعیہ میں کسقدر فرق ہے کہ بچہ بھی اگر بندر کو دیکھے گا
تو بندر ہی کہیگا یہ نہوگا کہ بعض اعضا کی مشابہت سے اوسکو آدمی کہدے۔ اسیطرح انسان
اور بندر کے لوازم و احکام میں فرق بیّن ہے انسان کا بات کرنا اپنے ما فی الضمیر کو بذریعہ خط و کتابت
وغیرہ دوسرے پر ظاہر کرنا امور تمدن میں ایک دوسرے کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ اسقدر ہیں کہ
بندروں میں ہرگز نہیں پائے جاتے۔ اگر بندر بھی نوع انسانی میں داخل ہوتا تو اوس کی
ضرورتیں اور احتیاجیں جو طبیعت نوعیہ سے متعلق ہیں اوسکو تمدن پر مجبور کرتیں اور بمقتضائے
ہمدردی معاونت باہمی سے حصہ لیتا حالانکہ بداہۃً ثابت ہے کہ جس قدر نوع انسانی کو
ضرورتیں اور حاجتیں لاحق ہیں بندروں میں انکا وجود نہیں۔
فن فرنیالوجی میں لکھا ہے کہ حکمائے سابق کے غلطی کی جو انسان کو حیوانوں کے
رتبہ سے از حد بڑہایا اور روح کو انسان کے ساتھ مختص کیا اور تمام قوتوں کو روح سے متعلق کر دیا

اور خیال نہ کیا کہ ادراک و فہم و مشقت کی قابلیت بعض حیوانات میں انسان سے بھی زیادہ ہے
اور تحقیق جدید سے ثابت کیا کہ کل قوائے روحانیہ جسم و دماغ سے متعلق ہیں۔ اور ہر ایک قوت
دماغ کی ایک قسم کی ساخت سے متعلق ہے خواہ انسان میں ہو یا حیوان میں۔

ہمیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان قوی کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے
مگر یہ ضرور کہینگے کہ انسان اور حیوانات گو شکل اور بعض شمائل اور اخلاق و عادات میں برابر ہوں
مگر انسانکی شرافت اور فضیلت کو کوئی حیوان نہیں پہونچ سکتا خصوصاً فضیلت تمدن کو اوسنے
تو تمام حیوانوں کو ذلیل و مسخر بنا دیا ممکن نہیں کہ تمام حیوان ملکر اب انسان کا مقابلہ کرسکیں اگر
تمدن کے فوائد پر گہری نظر ڈالی جائے تو ہمیں ذرا بھی شک نہ ہو گا کہ سعادت دنیوی تمدن سے
بڑھکر کسی چیز میں نہیں پھر جب یہ فضیلت اور کرامت خاص انسان کو حاصل ہے اور کل حیوانات
اوس سے محروم ہیں تو ماننا پڑیگا کہ نوع انسانی میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو حیوانات کو
نہیں دی گئی اور ایسی نعمت عظمیٰ سے محروم رکھے گئے۔

ماہرین فزیالوجی نے اقرار کیا ہے۔ جیسا کہ کوئب صاحب نے لکھا ہے کہ بعض اعضا جو انسانکے
دماغ میں ہیں حیوانوں کے دماغ میں پائے نہیں جاتے مثلاً اعضائے قیاسات جیسے
اعزاز غیری امید بحیلہ وغیرہ وغیرہ کہ خاص انسان سے تعلق رکھتے ہیں حیوانوں میں دیکھنے
میں نہیں آتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ گو انسان اور حیوان میں بعض امور شریک ہیں مگر بعض امور ایسے
بھی ہیں کہ کسی حیوان میں نہیں پائے جاتے اس سے ثابت ہے کہ نوع انسانی
قوت ممیزہ وغیرہ کی وجہ سے تمامی انواع موجودات میں اعلیٰ درجہ تک پہونچ گئی ہے اگر
سماعت اور بصارت اور دوسرے اوصاف میں حیوانات اوسکے شریک ہوں تو

اوسکی فضیلت پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا جیسے نباتات میں بھی قوت غاذیہ
اور نامیہ اور حیات ہوتی ہے اور وہ نر و مادہ بھی ہوتی ہیں جن میں اعضائے تناسل بھی
موجود ہیں جیسا کہ فن نباتات میں مصرح ہے مگر اس اشتراک سے انسانکی فضیلت میں کوئی
نقصان نہیں آتا۔

الحاصل دلائل عقلیہ اور ہزارہا سال کے تجربوں سے ثابت ہے کہ سوائے انسان کے
نعمت تمدن حاصل کرنیکی صلاحیت ہی کسی میں نہیں اور کیونکر ہو اوسکا منشا تو وہ مختلف حاجتیں
ہیں جو اوسپر مجبور کر رہی ہیں جنکا وجود سوائے انسان کے کسی میں نہیں پایا جاتا خدا تعالیٰ
کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمیں محتاج بناکر ایک اعلیٰ درجہ کی نعمت کا افتخار بخشا جسمیں کوئی ہمارا
ہمسر نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے یہ احتیاج کیسی قابل قدر چیز ہے کہ فخر الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام
فرماتے ہیں الفقر فخری۔ یہی احتیاج ہے کہ دین و دنیا کی نعمتیں اسکی بدولت حاصل ہوتی
ہیں دیکھہ لیجئے کیسی ہی عمدہ سے عمدہ نعمت ہو اگر اوسکی احتیاج نہو تو ہیچ ہے کسی بزرگ نے
کیا خوب کہا ہے ؎ آب کم جو تشنگی آور بدست ؎ اگر حق تعالیٰ ہماری فطرت میں ہر چیز کی
احتیاج داخل نفرماتا تو تمام عالم ہمارے حق میں بیکار رہتا اور مثل وحشیوں کے ہم بھی دولت
تمدن سے محروم رہجاتے مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی احتیاجوں کا بھی احساس نہیں کرسکتے
اسکو دیکھہ لیجئے کہ ہماری دینی اور دنیوی حالت کسقدر قابل اصلاح ہے مگر ہم کچھہ ایسے
خواب غفلت میں ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم اوسکی اصلاح کے محتاج ہیں یا نہیں۔
اگر ہمیں اپنی حاجتوں کا احساس بالتفصیل ہو اور اوسکے ساتھہ حاجت روائیوں کے
کارخانہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ محتاج بنانیوالے حکیم علی الاطلاق نے کسقدر سامان
حاجت روائیوں کا مہیا فرما دیا ہے مثلاً ادہر تشنگی دی تو ادہر پانی کے دریا بہادے

جنکو کوئی روک نہیں سکتا اور ادہر بہوک دی تو اودہر رزق کا ایک کارخانہ کہول دیا جس کی کارگزاریوں میں آفتاب ماہتاب جیسے آیات بینات سرگرم ہیں۔ سعدی فرماتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند | تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
همہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار | شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

اسی موقع میں حق تعالیٰ فرماتا ہے یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللّٰہ یعنے اے لوگو تم اللہ ہی کی طرف محتاج ہو۔ ہرچند ظاہرا ہماری احتیاج پانی غلہ وغیرہ کی طرف ہے مگر دنیا کوئی چیز ایسی نہیں جو خود بخود پیدا ہو جائے بلکہ ہر چیز ممکن ہونے کی وجہ سے اپنے وجود میں خالق کی طرف ضرور محتاج ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہر حاجت ہماری خالق عزوجل ہی سے متعلق ہے۔ اگر ہم اپنی حاجتوں پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ ہر ایک حاجت ہماری کتنی چیزوں سے متعلق ہے تو یہ ثابت ہو جائیگا کہ عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے کوئی نہ کوئی حاجت ہماری متعلق نہو گو اوسکو ہر شخص معلوم نہ کر سکے مثلاً بادی الرائے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری نشو و نما زمین پر ہے اسلئے کل حاجتیں ہماری زمین ہی سے متعلق ہونگی آسمان سے کوئی ہمارا تعلق نہونا چاہیئے مگر حکما نے اپنے تجربوں سے ثابت کر دیا ہے کہ انظار کواکب کو بھی عالم سفلی کی اصلاح میں مداخلت تامہ ہے اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے وسخر لکم الشمس والقمر دائبین یعنے آفتاب و ماہتاب کو تمہارے مسخر بنا دیا اور ارشاد ہے وخلق لکم ما فی الارض جمیعاً یعنے تمہارے لئے سبھی تمام چیزیں زمین کی پیدا کیں غرضکہ عالم علوی اور سفلی پر تفصیلی نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر آن میں ہم ہزارہا چیزوں کے محتاج ہیں پھر اگر بمقتضائے انسانیت ہر حاجت روائی کے وقت یہ سمجھا کریں کہ تمام حاجتیں ہماری خاص خدائے تعالیٰ سے

متعلق ہیں جنکو وہ وقتاً فوقتاً روا فرماتا ہے اسلئے کہ بغیر اوسکے کسی چیز کا وجود ممکن نہیں تو ہر وقت آیۂ شریفہ انتم الفقراء کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچا رہیگا جس سے دل خود بخود اپنے منعم اور محسن عزشانہ کا منقاد اور شکرگذار رہیگا اور کیا تعجب کہ اس شکرگزاری کے عوض میں اور بہت سی دنیوی و اخروی نعمتیں عطا ہوں کیونکہ جب اوسنے بغیر ہماری درخواست کے بے انتہا حاجتیں ہم میں پیدا کرکے دولت تمدن سے سرفراز فرمایا جسکی وجہ سے ہمارے بنی نوع ولقد کرمنا بنی آدم کے خطاب سے تمام عالم میں ممتاز ہوے تو ان حاجتوں کا احساس کرکے اگر حاجت روائیوں کا شکر ادا کریں تو بیشک نعمتوں کی زیادتی کے مستحق ہونگے جیسا کہ خود وعدہ فرماتا ہے ولئن شکرتم لازیدنکم۔

حق تعالیٰ نے تمام انواع میں سے صرف نوع انسانی کی فطرت میں جو بیشمار حاجتیں رکھیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ قبل تخلیق عالم حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس نوع کو عالم میں امتیاز تمدن عطا فرمادے اور اوس سے یہ استدلال بھی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ازلی محبت ہے جسکا حال اس مثال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر کسی مقتدر سخی بادشاہ کے یہاں کوئی اوسکا دوست مہمان ہو تو اوس مہمان کی جتنی حاجتیں زیادہ ہونگی بادشاہ کی خوشنودی کا باعث ہے تاکہ ایک ایک حاجت اوسکی روا کرے اور اپنی محبت اور عزت افزائی کا ثبوت دے اور اگر اوسکی حاجتیں کم ہوں تو حتی الامکان حاجتیں پیدا کرنے کی طرف اوسکی توجہ مبذول ہوگی مثلاً اوسکو بہوک کم ہو تو اشتہا پیدا کرنے والی اشیا کو استعمال کرانیکا حکم طبیبوں پر صادر ہوگا۔ غرضکہ مہمان کی زیادہ حاجتیں زیادتی خوشنودی کا باعث ہے اور اگر خود حاجتیں اوسکی کم ہوں اور اونکے پیدا کرنے پر وہ

قادر ہو تو اوسکی کم قسمتی پر بادشاہ کو افسوس ہوگا۔ مگر چونکہ خدائے تعالیٰ خود خالق ہے اسلئے اس
مکرم نوع انسانی کی فطرت ہی میں بے انتہا حاجتوں کو پیدا کر دیا اور اوسکی کل محتاج اشیا کو
عالم میں بکثرت پیدا کر کے خبر دی کہ وہ سب کچھ تمہارے لئے ہی ہمنے پیدا کیا ہے
کما قال تعالیٰ وخلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ اور اس بات کو سمجھنے کے لئے عقل بھی
دی جو کسی حیوان کو نصیب نہیں۔ پھر اوس مکرم نوع کو تمام انواع میں امتیاز اور افتخار حاصل
ہونے کی یہ تدبیر کی کہ انہی کی فطرتی حاجتوں سے اونکو مجبور کر کے اونکی عقل کو یہ راستہ بتایا
کہ سب باہم اتفاق کر کے تمدن قایم کر لیں اور اوسکے بعد وقتاً فوقتاً الہاموں کے ذریعہ سے
ترقی تمدن کی تدبیریں بتائیں۔

الحاصل تمدن کی بنیاد فطرتی طور پر ڈالی گئی جس سے اوس مکرم نوع انسانی کو سعادت دنیوی
کے حاصل کرنے کا عمدہ موقع ہاتھ آگیا اب اگر باوجود اتنے فضل و کرم کے کوئی شخص
کفران نعمت کرے اور ایسے افعال کا مرتکب ہو جو خلاف مرضی خالق اور تمدن کو ضرر
پہونچانے والے ہوں تو اوسپر اولئک کالانعام بل ہم اضل پورے طور پر صادق آجائیگا
ہرچند تمدن کی بنیاد فطرتی طور پر قایم ہوئی ہے جس میں انسان کے فعل و اختیار کو چنداں
دخل نہیں مگر عقل بھی اسکو مفید اور ضروری سمجھتی ہے اور یہ گواہی دیتی ہے کہ آدمی کے حق میں تمدن سے
بہتر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی اسلئے کہ کل دنیوی سعادتوں کا مدار اسی پر ہے کیسے ہی بیوقوف شخص سے
کہا جائے کہ آبادی کو چھوڑ کر جنگل میں اقامت کرے ہرگز اسکی عقل اسکو گوارا نہ کریگی۔ جب کل افراد
انسانی تمدن کو نعمت عظمیٰ سمجھتے ہیں تو چاہئے تھا کہ ہمیشہ اسکی حالت درست رہتی اور ہر شہر و قریہ میں
امن و امان قایم رہتا جو روح تمدن ہے اور جسطرح اسکی بنیاد ہمدردی پر رکھی گئی تھی اسمیں تغیر نہ آتا حالانکہ مشاہدہ اسکے
خلاف پر گواہی دے رہا ہے کہ بجائے ہمدردی دل آزاری ہے اور بجائے امن قائم

کرنے کے وہ تدابیر سوچی جاتی ہیں جن سے بدامنی اور بے اطمینانی پہیلے۔ جدہر دیکھئے
ایک دوسرے کا شاکی ہے۔ محکمجات سرکاری میں فوجداری وغیرہ مقدمات اس کثرت
سے رجوع ہوتے ہیں کہ اہل عملہ کو فرصت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہے کہ بجائے ہمدردی
کے جو منشاء تمدن کا تھا باہمی خصومت قایم ہوگئی جو باعث فساد تمدن ہے۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہر آدمی کی عقل جب تمدن کو ضروری سمجھتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ
برخلاف مقتضائے عقل لوگ اپنے ہاتھوں سے تمدن کو خراب کیا کرتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تمدن کو خراب کرنے والی بھی وہی فطرتی حاجتیں ہیں
جو باعث تمدن ہوئی تہیں کیونکہ جب آدمی کو کسی چیز کی حاجت ہوتی ہے تو وہ مجبوری
اوسکے حاصل کرنے میں عقل سے مدد لیکر رفع موانع اور تحصیل ذرایع کیطرف مشغول ہوتا ہے
اور جب تک کامیاب نہو تسکین نہیں ہوتی غرضکہ وہی حاجت اوسکو خود غرضی پر آمادہ کرتی ہے
جسکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اوسوقت نہ تمدن کے خراب ہونیکا خیال آتا ہے نہ اپنے یا دوسرے کے
ضرر کا۔ جب ہر شخص اپنی اپنی حاجتوں میں خود غرضی اختیار کرے تو ظاہر ہے کہ تمدنی حالت
کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوسکتی۔

اصل منشا خرابی تمدن کا ایک اور ہے جسکے بیان کے لئے تہوڑی سی تفصیل درکار ہے
وہ یہ ہے کہ آدمی کے نفس ناطقہ میں خالق عزوجل نے تین قوتیں رکھیں ہیں جن پر بقائے
شخصی اور بقائے نوعی کا مدار ہے۔ ایک قوت ملکیہ جس سے حقایق امور کا ادراک
متعلق ہے اور علم و حکمت کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے یہ قوت دماغ میں رکھی گئی ہے۔
دوسری قوت شہویہ جسکو بہیمیہ بھی کہتے ہیں اس سے تمام نفسانی خواہشیں مثل کہانے
پینے اور جماع وغیرہ کے متعلق ہیں اگر کہانے پینے کی خواہش آدمی کو نہو تو بدل ما یتحلل

نہ پہونچنے کی وجہ سے چندروز میں ہلاک ہوجائیگا اور جماع کی خواہش نہو تو نسل منقطع ہوجائیگی
اس قوت کا مقام جگر ہے۔ تیسری قوت غضبیہ جسکو سبعیہ بھی کہتے ہیں اس قوت سے آدمی
خطرناک امور پر پیش قدمی کرتا ہے۔ اسکا محل دل ہے۔ یہ تینوں قوتیں ایک دوسرے کے
مباین ہیں ان میں سے جو قوت زیادہ اور غالب ہوگی دوسری قوتیں ضعیف اور بعض وقت
کالعدم لیکن ہوجائینگی مثلاً قوت غضبیہ کو جب جوش ہوا اُسوقت نہ عقل ٹھکانے رہتی ہے نہ
کوئی خواہش نفسانی ہوتی ہے اسیطرح قوت شہویہ اور ملکیہ کی زیادتی اور غلبہ کیوقت
دوسری قوتیں ضعیف ہوجاتی ہیں۔ پھر ان قوتوں کی کمی و زیادتی ایک ایسی چیز سے
متعلق کی گئی ہے جو ہمارے اختیار سے خارج ہے اسلئے کہ باوجودیکہ وہ نفس ناطقہ
کی قوتیں ہیں مگر اعضا میں رکھی گئی ہیں اور اونکی کمی و زیادتی اون اعضا کی حرارت و
برودت سے متعلق کی گئی ہے۔ مثلاً جسکے دل میں حرارت زیادہ ہو تو اوسکا غصہ زیادہ
اور شدت سے ہوگا اور جسکے دماغ میں حرارت زیادہ ہو تو اوسکی فکر میں سرعت اور تیزی ہوگی جو
عقل سے متعلق ہے اور جسکے جگر میں زیادہ ہو تو قوائے شہویہ میں زیادتی ہوگی
اسیطرح حرارت کی کمی سے اون قوتوں میں کمی ہوگی۔ پھر اون اعضا میں جو سردی و گرمی
رکھی جاتی ہے اوسکا ایک اندازہ مقرر نہیں کسی میں کم ہے تو کسی میں زیادہ مثلاً کسی کے
دلمیں حرارت اسقدر ہوتی ہے کہ اوسکی زیادتی سے اختلاج پیدا ہوجاتا ہے اور کسی کے دل
میں اتنی کم ہوتی ہے کہ اوسکے بڑہانے کیلئے دوائیوں کی ضرورت ہوتی ہے یہی
حال جگر و دماغ کا ہے۔ غرضکہ قوائے بہیمیہ اور سبعیہ اور ملکیہ کی کمی و زیادتی اعضاء رئیسہ
کی حرارت و برودت سے متعلق کی گئی ہے اور وہ ہمارے اختیار سے خارج ہے
اور ظاہر ہے کہ جو افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں اونکا مدار اونہی قوتوں پر ہے

اسلئے ممکن نہیں کہ سب کے افعال ایک طور پر صادر ہوں بلکہ جسپر قوت بہیمیہ کا غلبہ ہوگا
اوس سے وہ افعال زیادہ صادر ہونگے جو بہائم سے ہوا کرتے ہیں اور جسپر قوت سبعیہ کا غلبہ
ہوگا اوس سے وہ افعال زیادہ صادر ہونگے جو درندوں سے ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی
لوگ زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے کہ عقل جو مدرک حقایق اور کمل علم و حکمت ہے اکثر محسوسات
اور وجدانیات کے مقابلہ میں پسپا ہوا کرتی ہے لذاید جسمانی کا احساس وقتاً فوقتاً آدمی کو اپنی
طرف ایسا مائل کر لیتا ہے کہ ادراکات روحانی کی نوبت ہی نہیں آتی اور ابھی معلوم
ہوا کہ ایک قوت کے غلبہ سے دوسری قوت مغلوب ہوجاتی ہے اسلئے قوائے بہیمیہ
اور سبعیہ کے متواتر غلبوں سے قوت ملکیہ اکثر مغلوب اور بیکار رہیگی۔ یہ آثار طبعی حرارت
اور برودت کے ہیں پھر اوس حرارت کو بڑہانے اور گھٹانے والے اسباب خارجیہ
بھی بکثرت ہیں جیسے دن رات فصول اربعہ مختلف غذائیں دوائیں حرکات و سکنات
وغیرہ جن سے باطن انسان میں حرارت یا برودت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ غرضکہ ان
اسباب داخلیہ و خارجیہ سے آدمی کی قوائے نفسانیہ پر ایسا برا اثر پڑتا ہے کہ قوائے
بہیمیہ اور سبعیہ کو قوت اور ترقی ہوتی ہے جس سے جانوروں کے سے افعال اکثر
صادر ہوا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حیوانات میں انہی افعال کی وجہ سے تمدن کی
صلاحیت نہیں اسلئے تمدنی حالت ہمیشہ مخدوش رہتی ہے اور نفس ناطقہ کو قوائے
بہیمیہ اور سبعیہ کے غلبہ سے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ قوت ملکیہ سے کام لیکر اصلاح
تمدن وقتاً فوقتاً کر سکے۔

فن فرنیالوجی جسمین کاسۂ سر سے متعلق مباحث ہیں اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سر کے
فلاں مقام سے فلاں صفت اور فلاں خلق متعلق ہے۔ اوسمیں مقاومت کا مقام بتلاکر

لکھا ہے کہ اگر یہ مقام کشادہ ہو اور اوسکے ساتھ مقام تخریب بھی کشادہ ہو تو ایسے
شخص سے جھگڑے کج بحثیاں طرح طرح کے فساد ایذا دہی خون ریزی وغیرہ فسادات
ظہور میں آئینگے اور مقام امساک یا خواہش فراہمی تبلا کر لکھا ہے کہ اسکی کشادگی ہو تو
آدمی چوری کرتا ہے۔ اور مقام اعزاز ذاتی یا حفظ مراتب تبلا کر لکھا ہے کہ وہ باعث
گستاخی خودستائی خودغرضی آزادی ہے اسیطرح بہت سے اخلاق کے مقامات معین کئے
ہیں غرضکہ تحقیق جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق قبیحہ بعضوں کی جبلت ہی میں داخل
ہوتے ہیں جن سے تمدن کو ضرر پہونچتا رہتا ہے۔ بہرحال تمدن کو بگاڑنے والے
افعال کا صادر ہونا افراد انسانیہ سے فطرتی طور پر لازم ہے خواہ انکا منشا مقامات
دماغ ہوں یا حرارت و برودت اعضائے رئیسہ اور یہ تو خود مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بعضوں
کی طبیعت میں قوائے غضبیہ کے آثار مثل تکبر بدخلقی قساوت قلبی حسد کینہ وغیرہ پائے
جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت میں آثار قوت شہویہ مثل فسق فجور و حرص و بخل وغیرہ۔

اب غور کیا جائے کہ انسان میں صفات بہیمیہ اور سبعیہ جب پورے طور پر پائے جاتے ہیں
اور غلبہ حاصل کرنے کے آلات جو حیوانوں کو دئے گئے ہیں فطرۃً اوسکے پاس بھی موجود
ہیں اور علاوہ اونکے اوسکو عقل ایسی دی گئی ہے کہ تلوار و بندوق اور توپ جیسے آلات کے
ایجاد پر قادر ہے تو کیا ممکن ہے کہ تمدنی حالت درست رہ سکے ہرگز نہیں۔ اس خرابی
کو دور کرنے کیلئے عقل نے مشورہ دیا کہ ایک قوت ایسی قائم کی جائے کہ وحشی طبعوں کو
مقہور کرکے حالت تمدن کی اصلاح وقتاً فوقتاً کیا کرے۔ چنانچہ سب نے ایک شخص کو
بادشاہ مقرر کیا اور اس بات پر راضی ہو گئے کہ اپنی جان و مال میں واجبی طور پر جو کچھ
تصرف کرے سب قبول کرینگے تاکہ وحشی طبیعت والے گرگ سیرتوں سے نجات ملے اور اوسکو

رائے اور اجرائے احکامات میں مدد دینے کیلئے ایک جماعت منتخب کی گئی اور سلطنت
کی بنیاد قائم ہوئی۔ چنانچہ سلطنت نے وہ کام اپنے ذمہ لیا اور حتی الامکان ایسے قواعد
ایجاد کئے کہ ظلم و زیادتی کی بیخ کنی ہو اور تمدن کو خراب کرنے والوں کی سرکوبی کرکے اصلاح
تمدن کی فکر کی تاکہ ہر شخص فارغ البال ہو کر امن و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرے
اور رعایا اور سلطنت میں ہمدردی کی نسبت قائم رہے۔

مگر سلاطین اور اعوان سلطنت بھی آخر اسی نوع انسانی کے افراد تھے یہ تو ممکن نہیں
کہ اون سب کی قوت ملکیہ اونکی قوت بہیمیہ اور سبعیہ پر غالب ہو اور لذائذ جسمانیہ اور قوت
غضبیہ سے مبرّا ہو سکیں اسلئے ایسے بعضے سلاطین اور اعوان سلطنت کا پیدا ہونا
بھی لازم تھا کہ بجائے اصلاح حالت تمدن زیادہ ابتر ہوا اسلئے کہ طبیعت انسانی عیش پسند
واقع ہوئی ہے اور اوسکا مقتضے ہے کہ لذائذ جسمانی جو سعادت دنیوی ہیں جسطرح ممکن ہو
حاصل کرے پھر سب حکام کو حکومت حاصل ہو اور اونکو نفسانی خواہشوں سے روکنے
والی کوئی چیز نہو اور رعایا اونکے مقابلہ میں مجبور بے دست و پا ہوں تو ظاہر ہے کہ اونکے
قوائے شہویہ اور غضبیہ کیسے آزادانہ اور بیباکانہ تصرف کرتے ہونگے ایسی حکومت
میں رعایا کے حسب حال یہ شعر ہوگا ؎

گر از چنگال گرگم در ربودے چو دیدم عاقبت خود گرگ بودے

بلکہ ایسی حکومت تمدن کے حق میں زیادہ تر مضر ہے کیونکہ ظالم صرف اپنی ذاتی قوت
سے تمدن کو ضرر پہونچاتا تھا اور یہاں اوسکے ساتھ قوت حکومت مددگار ہے اگر کتب تواریخ
دیکھی جائیں تو صفحے کے صفحے ایسے حکام کے حالات سے سیاہ نظر آئینگے جب حکام
جنکی ضرورت صرف اصلاح تمدن کے لئے عقل سے ثابت ہے خود خرابی تمدن کے

باعث ہوں تو بتاؤ کہ اسکے بعد اصلاح تمدن کی کیا امید ہو سکتی تھی۔

غرضکہ جسطرح تمدن کو قایم کرنے والے اسباب خالق عزوجل نے پیدا کئے اوسکے بگاڑنے والے اسباب بھی اونکے پہلو بہ پہلو پیدا کئے۔

اب یہاں عقل حیران ہے کہ فطرت تمدن کو قایم بھی کر رہی ہے اور بگاڑ بھی رہی ہے حالانکہ مقتضائے فطرت وطبیعت ایک قسم کا ہوتا ہے مگر عقل کی حیرانی یوں دفع کی جاتی ہے کہ فطرت بھی ایک مخلوق چیز ہے حکیم علی الاطلاق جو چاہتا ہے اوس سے کام لیتا ہے دراصل خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس مکرم نوع انسانی کو ابدالآباد کی سعادت سے ممتاز اور سرفراز فرماوے اسلئے جسطرح کثرت احتیاج سے سعادت دنیوی کی بنیاد ڈالی تھی اوسی طرح اون حاجتوں کو پیدا کرنے والے قوائے شہویہ اور غضبیہ سے ابدی سعادت کی تمہید کی۔ اور اوسکی تخلیق اس طور پر ہوئی کہ جتنے قوی اور صفات جانوروں کے ہیں سب اوسکو دی گئیں جس سے اشتباہ ہوگیا کہ وہ بھی ایک جانور ہے اور بعضوں نے تو صاف کہدیا کہ ہم بندروں کی نسل سے ہیں مگر اوسکو تمام عالم میں ممتاز کرنے کیلئے ایک عقل ایسی دی کہ کوئی جانور اب اوسکی ہمسری نہیں کر سکتا اور اوسکی فطرت میں تحصیل علم اور تحقیق کا مادہ رکھا گیا چنانچہ جو لڑکا عقل ہیولانی سے قدم باہر رکھتا ہے تو ہر نئی چیز کو دیکھکر پوچھتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جس سے مقصود تحقیق ماہیت ہے کیونکہ منطق میں مصرح ہے کہ ماھو جس کا ترجمہ وہی لڑکوں کا سوال ہے دریافت ماہیت کیلئے موضوع ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ابتدائے زمانۂ شعور سے ماہیات اشیا کی تحقیق شروع ہوتی ہے۔ اسکے سوا جہاں دو شخص باتیں کرتے ہوئے نظر آئینگے اون میں ضرور ایک دوسرے سے دیکھی یا سنے ہوئے

واقعات بیان کرتا ہوگا اور سننے والا نہایت توجہ سے وہ سنتا ہوگا جس سے مقصود صرف تحصیل علم ہے اسیوجہ سے اگر کوئی دیکھی یا سنی ہوئی بات ہو تو سننے والا کہدیتا ہے کہ میں بھی سن چکا ہوں۔ اور اگر کوئی نادر بات بیان کی جائے تو نہایت دلچسپی اور تحیر سے سنی جاتی ہے جس سے بیان کرنیوالے کو قدردانی کا لطف آجاتا ہے اسیوجہ سے اکثر نادر نادر واقعات یاد رکھکر مجلسوں اور احباب میں بیان کیا کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ تقریباً کل گفتگو جو لوگ باہم کیا کرتے ہیں اسی غرض سے سنی جاتی ہے کہ جو بات معلوم نہیں وہ معلوم ہو۔ غرضکہ آدمی کی فطرت علم دوست اور تحقیق پسند واقع ہوئی ہے۔

یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ جب ادنیٰ ادنیٰ واقعات اور ماہیات اشیا کے حاصل کرنے میں اسقدر دلچسپی ہوتی ہے تو مقتضائے عقل یہ ضرور ہونا چاہیے کہ آدمی پہلے اپنی اور عالم کی حقیقت معلوم کرے کہ وہ ممکن ہے یا واجب۔ اور جب اجزائے عالم کو دیکھکر یہ معلوم ہو جائے کہ خود بخود کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کوئی پیدا نکرے تو عقلاً اسے خالق عالم کا ثبوت ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تقریباً کل انسان خالق کے قائل ہوں۔ اسکے بعد فطرتی تحقیق پسندی کا مقتضی ہے کہ اپنے خالق کے حالات اور کیفیت تخلیق عالم وغیرہ امور معلوم کرے اس لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ثابت ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کے اور ہمارے بیچ میں واسطہ ہو اور تشنگان علوم آلٰہیہ کو اونکے خالق کے حالات اور پیام پہونچایا کرے۔ یہاں اسبات کیطرف توجہ کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں کہ وہ شخص پیغامبر کیسا ہونا چاہیے اور اوسکے پہچاننے کے کیا طریقے ہیں کیونکہ وہ ایک مستقل بحث ہے یہاں

اسیقدر معلوم کرنا کافی ہے کہ عقل کی رو سے نبی کی ضرورت ثابت ہے۔

رہی یہ بات کہ بہت سارے عقلا اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کرتے سو اوسکے اسباب دوسرے ہیں منجملہ اونکے ایک یہ ہے جو ابھی معلوم ہوا کہ قوت شہویہ اور غضبیہ کے جھگڑوں میں نفس ناطقہ ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ قوت ملکیہ سے کام لینیکی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر یہ عذر اوس کا قابل قبول نہیں ہو سکتا اسلیئے کہ جب اوسکی فطرت میں تحقیق حقایق اور ہر قسم کے اوراکات کی طرف توجہ تام رکھی ہے تو اوسکو ضرور ہے کہ انبیا علیہم السلام نے جو خبریں سنائی ہیں اونمیں غور و فکر کرکے خالق کی تصدیق کرے جسطرح تقریباً کل بنی نوع انسانی اوسکی تصدیق کرتے ہیں گو اونمیں مشرک بھی ہیں مگر وہ بھی ایک خالق کو ضرور مانتے ہیں اسلیئے جب تین کو مثلاً کسی نے مان لیا تو ایک کو بطریق اولیٰ مانا۔ یہ بحث دوسری ہے کہ اس قسم کے توحید مفید ہوگی یا نہیں۔ ہمارا مقصود یہاں اسیقدر ہے کہ عقل تحقیق پسند خالق کے وجود کو ضرور مانتی ہے۔ اگرچہ عقلا صرف دنیوی کام میں لگ کر اس طرف توجہ نکریں اور خالق کو نہ مانیں تو وہ تقریباً تمام انسانوں کے مقابلہ میں کسی شمار میں نہیں آسکتے۔

بعض حکما نے جو صرف دنیوی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے حقایق اشیا میں خوض و فکر کی اور اوس سے منافع دنیوی بھی حاصل کئے اور خدا کیطرف بالکل توجہ نہ کی اونپر یہ الزام ضرور عاید ہوتا ہے کہ اسقدر سعادت دنیوی کے پیچھے کیوں پڑ گئے کہ سعادت دینے والے سے بالکل اعراض اور انحراف ہو گیا۔ اتنا تو جانا ہوتا کہ جس عقل کے ذریعہ سے یہ سعادتیں حاصل ہوئی ہیں نہ اوسکو اپنی ذات سے پیدا کیا نہ کسی سے مستعار لیا آخر وہ بھی عدم سے وجود میں آئے اور کسی چیز کا وجود میں آنا ممکن نہیں جب تک تعلق

اوسکو وجود نہ دے اونے چھوٹا خود بخود نہیں بن سکتا پھر اتنا بڑا عالم اور عقل جیسی بے نظیر چیز بغیر خالق کے بنائے کیونکر بن گئی۔ اور ایسی بے بدل نعمتیں دینے کا عقلاً کوئی حق ہے یا نہیں۔ اور اوس نے انبیا کے ذریعہ سے جو اپنے حقوق معلوم کرائے اونمیں غور کیا ہوتا کہ آخر ہم آدمی ہیں جانور نہیں جو مرفوع القلم ہوں۔ ہم جس بادشاہ کے ملک میں رہیں اوسکی سیادت کا اعتراف کرنا اور حقوق شاہی کا ادا کرنا ہمپر ضرور ہے۔ جب بادشاہ کا اعتراف کرنا اور حقوق کی ادائی ضرور ہے تو خالق جسنے ہمیں پیدا کیا اور جسکی خدائی میں ہم بستیاں آباد کرکے بے انتہا فوائد حاصل کرتے ہیں اوسکا اعتراف اور اوسکے حقوق کی ادائی کس قدر ضروری ہوگی۔ پھر کسی نبی نے یہ فرمایش نہیں کی کہ دنیا چھوڑ کر ہمہ تن عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤ بلکہ نبی نے اس عالم میں آسایش سے بسر کرنے کے وہ طریقے بتلائے کہ سب مرفہ الحال اور دولت تمدن سے مالا مال ہو جائیں اور سعادت دنیوی پورے طور پر حاصل کرسکیں لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم جس سے صاف اجازت دینی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے علم سے کلیں ایجاد کرو۔ تجارت کرو۔ زراعت کرو۔ جو چاہو کرو مگر خالق کا اعتراف کرکے چند حقوق اوسکے ادا کر دو۔ پھر یہ ادائے حقوق بھی بیکار نہ جائیگی بلکہ اوسکے صلہ میں ہمیشہ کے لئے ایسی ایسی نعمتیں دی جائینگی جنکا مثل کسی نے دیکھا نہ سنا۔

ہر چند بات بہت آسان تھی اور جتنی مشقتیں دنیا طلبی میں کی جاتی ہیں اوتنی بھی مشقت اوسمیں نہیں مگر یہاں ایک راز ہی دوسرا ہے ممکن نہیں کہ ہر کس و ناکس خدا اور رسول کی تصدیق کرلے اسکو دیکھ لیجئے کہ کیا ممکن ہے کہ کوئی نوع جانوروں کی

اپنے میں حاجتوں کو پیدا کرکے نعمت تمدن حاصل کرے ہرگز نہیں اسیطرح ممکن نہین
کہ ہر شخص خدا و رسول کی تصدیق اپنے میں پیدا کرکے سعادت ابدی کا استحقاق
حاصل کرے کیونکہ جسطرح سعادت دنیوی کے لئے حق تعالے نے صرف ایک
نوع انسانی کو خاص فرمایا اسیطرح سعادت ابدی کے لئے اسی نوع کی ایک صنف کو
مختص فرمایا اور باقی سب لوگ اس جرم میں مستحق شقاوت ابدی ہوئے کہ باوجود
عقل اور تمیز اور اقتضاے فطرت اور دعوت انبیاؑ کے نہ اپنے خالق کو مانا نہ اوسکے
حقوق ادا کئے۔ اب اونکو مجال چون و چرا نہیں اور نہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہمارے
ہم جنس جنت میں رہیں اور ہم دوزخ میں کیونکہ خداے تعالے نے اونکو عقل دی اور
دولت تمدن سے ممتاز کرکے ہر طرح کی سعادت دنیوی دی پھر انبیا علیہم السلام
کو بھیجا تاکہ اتمام حجت کریں باوجود اسکے انہوں نے کل نعمتوں کی ناشکری کی اور عقل
کو دنیوی کاموں میں لگادیا قوت ملکیہ کو بیکار کردیا اور مثل بہایم کے قوت بہیمیہ اور سبعیہ
ہی کے مسخر رہے۔ اگر جانور یہ عذر پیش کریں کہ ہم نے کیا قصور کیا تھا جو دولت تمدن
اور سعادت دنیوی سے محروم رکھے گئے تو کسیقدر اونکا عذر قابل توجہ ہوسکتا ہے
بخلاف اسکے کفران نعمت کرنے والے کافروں کا عذر ہرگز قابل سماعت نہیں ہوسکتا
اسلئے کہ اونکو عقل دیکر سوچنے اور تحقیق کرنے کا موقع عمر بھر دیا گیا اور انبیاؑ کو بھیجکر حجت
تمام کردی گئی اسپر بھی اونکو جنبش نہوئی۔

سبحان اللہ کیسی حکمت بالغہ ہے کہ خالق عزوجل سے کوئی معترضانہ سوال ہی
نہیں کرسکتا۔ جانوروں کو تو عقل ہی نہیں جس سے بھلی بری میں تمیز کرکے اپنی
بے نصیبی اور محرومی پر مطلع ہوں اور سوال کی نوبت آئے البتہ آدمیوں کو عقل ہے

مگر جب انہوں نے عقل سے خدا طلبی کا کام ہی نہ لیا اور بعضوں نے جو لیا تو اوسیکو
رہزن بنالیا تو اب کس منہ سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم کیوں محروم کئے گئے۔ صدق
اللہ تعالے لا یسأل عما یفعل وھم یسألون وقولہ تعالی وللہ الحجۃ البالغۃ۔
اب یہ دیکھنا چاہئے کہ سعادت ابدی حاصل کرنیوالوں نے کیا کام کیا جس سے
وہ اس دولت عظمی کے مستحق ہوئے۔ ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ
انہوں نے قوت بہیمیہ اور سبعیہ کو مغلوب کرکے قوت ملکیہ کو موقع دیا کہ اطمینان سے
اپنا کام کرے کیونکہ بغیر اس تدبیر کے ممکن نہ تھا کہ وہ کچھ کام کرسکے جیسا کہ ابھی معلوم
ہوا کہ ان قوتوں میں مباینت ہے جو قوت مطلق العنان اور غالب کردی جائے
دوسری قوتیں اوسکے مقابلہ میں مغلوب بلکہ بیکار ہو جائینگی۔ غرضکہ اونکی عقل کو
جب غور و فکر کرنے کی فرصت ملی تو اوسنے یہ بات بدلائل ثابت کردی کہ عالم کا
ایک خالق ہے اوسکی طرف سے پیغاموں کا پہنچنا اور اوسکے حقوق بندوں پر واجب الادا
ہونا ایک ضروری بات ہے پھر پیغامبروں کے حالات پر اوسنے غور کیا تو یہ بات
قابل تصدیق معلوم ہوئی کہ جب تک وہ حضرات من جانب اللہ مامور نہوئے ہوں
نہ اونسے معجزات صادر ہوسکتے تھے نہ ایسے افعال جو اقتدار نفوس بشریہ سے
خارج ہیں۔ پھر اون حقوق پر غور کیا جو بندوں پر مقرر ہیں دیکھا کہ کچھ تو خیال سے متعلق
ہیں اور کچھ جوارح سے جن سے افعال صادر ہوتے ہیں اور اون سب میں یہ
بات مدنظر ہے کہ اگر وہ پورے پورے ادا کئے جائیں تو سردست فائدہ یہ
کہ حالت تمدن کی اس درجہ اصلاح ہوجائیگی کہ دنیا میں کسیکو کسی سے شکایت کا
موقع ہی نہ ملیگا اور پورے طور پر امن قایم ہوجائیگا۔ الحاصل جب انہوں نے تعصب

اور عناد وغیرہ موانع سے خالی الذہن ہوکر ان امور میں مکرر مکرر غور کیا تو اونکو یقین ہوگیا
کہ بے شک یہ کل احکام جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں سب خدائے تعالیٰ
کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اوسکے صحیح ہونے میں
ذرا بھی شک نہیں۔ جس کام کے کرنے یا نکرنے پر جنت یا دوزخ کا وعدہ یا وعید
حدیث شریف میں وارد ہے اوسپر ایسا یقین کہ گویا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو اس
مشاہدہ کی وجہ سے کوئی ناشایستہ حرکت ہی کیوں صادر ہونے لگی اور اگر خواہش
نفسانی کے غلبہ سے کوئی صادر ہو بھی گئی تو بغیر مطالبہ کے درخواستیں پیش ہو رہی
ہیں کہ جو کچھ سزا ہو اسی عالم میں ہو جائے۔ چنانچہ ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ تمامی اسلامی
دنیا میں مشہور ہے کہ جب اتفاقاً اونسے زنا صادر ہوگیا تو فوراً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں حاضر ہو گئے اور درخواست کی کہ رجم کا حکم صادر فرمایا جائے حضرت نے
کسیقدر تاخیر کی مگر سزائے اخروی کے مشاہدہ سے بار بار یہی عرض کرتے تھے
کہ اب تاخیر نہ فرمائی جائے۔ چنانچہ جب رجم ہو چکا اوسوقت اونکی جان کو تسکین ہوئی

جنگ قادسیہ میں جب رستم فوج کثیر اور بہت سے ہاتھیوں کو لیکر مسلمانوں کے
مقابل ہوا اور لڑائی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ اوسوقت ابو محجن ثقفی جو شراب پینے کے جرم
میں مقید تھے قید خانہ کے دریچہ سے لڑائی کا تماشہ دیکھکر بے اختیار ہوئے
جاتے تھے آخر ضبط نکر سکے اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمی
کے پاس گئے کہ خدا کے لئے اسوقت مجھے چھوڑ دو لڑائی سے جیتا بچا تو خود
آکر بیڑیاں پہن لونگا۔ چنانچہ اونہوں نے اونکی بیڑیاں کاٹ دیں انہوں نے فوراً گھوڑے پر
سوار ہوکر اس زور شور سے لشکر مخالف پر حملہ کیا کہ جس طرف نکل گئے صف کی صف

الٹ دی اسیطرح دن بھر حملہ کرتے رہے جس سے سعدؓ اور سب مسلمانوں کو تحیر تھا کہ یہ کون
بہادر ہے جو اسطرح بہادری کر رہا ہے۔ جب شام ہوئی تو خود قید خانہ میں جاکر
بیڑیاں پہن لیں سلمیٰؓ نے سب حالات سعدؓ سے بیان کئے اونہوں نے اسیوقت
انکو رہا کر دیا اور کہا کہ خدا کی قسم مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو میں اسکو سزا نہیں دیسکتا
ابو محجن نے کہا کہ میں بھی آج سے پھر کسی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤنگا۔ دیکھئے یہ ایمان ہے
قید خانہ میں پڑے سزا بھگت رہے ہیں۔ مگر دل میں ایمان اس درجہ جوش زن ہے
کہ اسکا ذرا بھی ملال نہیں پھر اس حیرت انگیز جانبازی کے بعد ایک لفظ تک
زبان پر نہ آیا کہ آج ہم نے یہ کام کیا بلکہ حسب وعدہ اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں
پہن لیں اور باوجود اس شجاعت خداداد کے حکم شرعی میں ذرا بھی فرق
نہ آنے دیا۔

اصل منشا اسکا یہ تھا کہ جب یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی ان اللہ اشتری من
المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ یعنے خدائے تعالیٰ نے
مسلمانوں کی جان و مال جنت کے معاوضہ میں خرید لئے) تو اہل ایمان نے اپنی
جان و مال پر سے اپنا تصرف اٹھا کر خدائے تعالیٰ کے تصرف میں دیدیا کہ جس طرح کا
حکم ان میں جاری فرمائے سر مو انحراف نہو گا گویا جان و مال کو اپنے پاس صرف عاریت
سمجھتے تھے۔ جنگ یرموک میں جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور عیسائیوں کے حملوں سے
مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور شرحبیلؓ کو کفار نے گھیر لیا اوسوقت آپ کی یہ حالت تھی
کہ رومیوں کا چاروں طرف سے نرغہ تھا اور آپ پہاڑ کی طرح بیچ میں ڈٹے کھڑے
یہ آیت پڑھ رہے تھے ان اللہ اشتری من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ

اور نعرہ مارتے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں یہ آواز جسکے کان میں پڑی بے اختیار لوٹ پڑا یہاں تک کہ اُکھڑی ہوئی فوج بھی سنبھل گئی اور شرحبیلؓ نے اُنکو لیکر اس بہادری سے جنگ کی کہ رومی جو ٹوٹے چلے آتے تھے بڑھنے سے رک گئے۔ غرضکہ خدا کی راہ میں جان کا دینا اُن پر اتنا بھی گراں نہیں ہوتا جسقدر ہم پر راہ خدا میں پیسہ دینا گراں ہوتا ہے۔

الحاصل اُنکے ایمان نے اُنکے قوائے شہویہ اور غضبیہ پر اسقدر گہرا اثر ڈالا تھا کہ تقریباً کوئی فعل اُن سے صادر نہیں ہوتا جو خلاف مرضی الٰہی ہو۔ اسی ایمان کی بدولت ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتا تھا ایسے بھائی نہیں جو آجکل دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے کہ اجنبی شہروں کے لوگ کہ جنکو نہ کبھی دیکھا نہ اُنکا نام سُنا جب اپنے شہروں میں آ گئے تو تقسیم کر کے برابر آدھا مال اُنکو دیدیا اور اگر دو بیبیاں کسی کے نکاح میں ہیں تو کہدیا کہ جسکو چاہو پسند کر کے نکاح کر لو اور اُسکو طلاق دینے پر مستعد ہو گئے اب بتلائیے کیا اس سے بڑھکر کوئی ہمدردی اور اخوت ہو سکتی ہے۔

ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ جس قوم میں یہ اتحاد و ہمدردی ہو وہاں کے تمدن کی کیا حالت ہو گی اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایمان اور تمدن میں کس قسم کا ربط ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی تعلیم میں ایک عام بات تھی اسکے سوا ہر ایک جزئی اور خاص خاص معاملات تمدن میں جو جو تعلیمیں ہوئی ہیں اُنکی گنجایش اس مختصر میں کہاں اُن سے تو کئی علم مدون ہو گئے جنکی ہزارہا کتابیں موجود ہیں۔ مجملہ اُنکے چند امور بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔

وہ امور جنکے کرنیکی فضیلت اور تاکید ہے

ہر کام میں نیک نیتی۔ صدق۔ راست بازی۔ اتحاد باہمی۔ خوش خلقی۔ امانت داری۔ دیانت داری۔ ایک دوسرے کی مدد۔ سفارش۔ حاجت روائی۔ بیمار پرسی۔ مسافر نوازی۔ ایفائے وعدہ۔ اصلاح بین الناس۔ ادائی شہادت۔ مشورت۔ نیک مشورت دینی۔ تواضع۔ قناعت۔ عفو تقصیر۔ عیب پوشی۔ ماں باپ اور اپنے حاکم کی فرمانبرداری۔ کل حقوق کی ادائی۔ بزرگوں کی تعظیم۔ چھوٹوں پر شفقت۔ صلہ رحمی۔ جو بات اپنے لئے پسند کی جاتی ہے دوسرے کیلئے پسند کرنی۔ محتاجوں کی خبر گیری۔ سخاوت۔ رحم۔ لونڈی غلام کو اپنے بھائی بہن کے برابر سمجھنا اور آپ جو کھاتے اور پہنتے ہیں اُنکو بھی وہی کھلانا اور پہنانا۔ فریاد رسی۔ ظالم کے پنجے سے مظلوم کو چھڑانا۔ عدل و انصاف۔ جس کام پر اُجرت لی گئی اوسکو دیانت اور عمدگی سے ادا کرنا۔ مسافر خانے۔ پل۔ کنویں اور راستوں کی تعمیر و ترمیم۔ اشاعت علم میں کوشش۔ حرفہ اور کسب سے اپنی اور اپنے عیال کی پرورش۔ ہر کام اُسکے اہل سے لینا وغیرہ وغیرہ۔

وہ امور جن سے بچنے اور احتراز کرنیکی تاکید ہے

جھوٹ۔ وعدہ خلافی۔ عہد شکنی۔ جھوٹی گواہی۔ افترا پردازی۔ بہتان۔ غیبت۔ چغلی۔ سخن چینی۔ لوگوں کے عیوب کی تجسس۔ استہزا و تمسخر۔ تحقیر۔ توہین۔ ہجو۔ دلشکنی۔ سخت کلامی۔ سب و شتم۔ فحش و بیہودہ گوئی۔ فتنہ انگیزی۔ مکر۔ فریب۔ چاپلوسی۔ قماربازی۔ ناپ تول کی کمی۔ دغا بازی۔ غصب۔ چوری۔ مفسدہ پردازی۔ بغاوت۔

غارتگری - اذیت رسانی - سوال - بھیک مانگنی - حرص - طمع - عداوت - بغض - حسد
کینہ - تین روز سے زیادہ کسی سے رُک کے رہنا - تخویف - جن امور سے نزاع اور جھگڑے
پیدا ہوں اُنکا ارتکاب - نشہ کی چیزوں کا استعمال - ظلم - رشوت - لوگوں کی آمد و شد کے
مواقع کو تجسس کرنا جس سے اُنکو تکلیف ہو - احتکار یعنی غلہ کو اِس خیال سے روک رکھنا کہ اگر مہنگا
ہوگا تو بیچیں گے وغیرہ

اسمیں شک نہیں کہ حکما بھی اصلاح تمدن کے کچھ اصول ایجاد کرتے رہتے ہیں
اُن میں بھی اکثر اسی قسم کی باتیں ہیں مگر صرف اصول قرار دینے سے قوائے شہویہ
و غضبیہ کی اصلاح ممکن نہیں اسلئے کہ جو قواعد عقل سے ایجاد کئے جاتے ہیں اُنکے
توڑنے کی تدبیریں بھی عقل ہی سے ایجاد کر لیا کرتے ہیں مثلاً جھوٹ کہنا قانون میں
بھی جرم ہے - مگر جنکو ایمان سے کوئی تعلق نہو اپنا مقصود حاصل کرنیکی غرض سے جس
بات کو چاہیں خلاف واقع قانونی پیرایہ میں لا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ اس خلاف واقعہ
یعنے جھوٹ کا ثابت ہونا ہی مشکل ہوگا - اِسی پر تمام جرموں کا قیاس ممکن ہے - اس
سے ظاہر ہے کہ قانون حکما کا مقتضٰی نہیں ہو سکتا کہ اصلاح تمدن ہو بلکہ خود غرض بد
سیرتوں کی عقلوں کو اس طرف متوجہ کر دے گا کہ واقعات کی حیثیت اور نوعیت بدلکر
کسی قانونی دفعہ کے تحت میں داخل کر دیں اور جسطرح ممکن ہو اپنی خواہشیں پوری کیا کریں
جس سے راستی پسند جنکی طبیعت میں مکر و فریب و دغابازی نہو ہمیشہ ایسے لوگوں کے
قابو میں اسطرح پھنسے رہینگے جیسے بکری بھیڑیئے کے جنگل میں ہوتی ہے -

بخلاف اسکے ایمان کا ذاتی مقتضٰے یہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت جسمیں کسی کی حق تلفی
یا ظلم و زیادتی ہو ہرگز وقوع میں نہ آسکے اسلئے کہ ہر ایماندار جسکو کامل یقین ہو کہ خدا تعالیٰ

دل کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور ہر بات کی جزا و سزا دوسرے عالم میں ضرور ہونیوالی ہے
اور ایک روز ایسا آنیوالا ہے کہ خدا کے روبرو ہم حاضر ہوں گے اور اُن تمام اعمال کا محاسبہ
ہوگا جو ساری عمر میں کئے تھے - اور جرایم کا اثبات اس طور پر ہوگا کہ علاوہ دوسرے
گواہوں کے خود ہمارے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضا ہمارے گناہوں پر گواہی دیں گے
جسکا انکار ہم سے ممکن نہوگا - تو ایسا شخص کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ہم خواہش نفسانی کو کسی
حکم شرعی کے تحت میں لا کر خدائے تعالیٰ کو دھوکہ دینا ممکن ہے اسلئے ہر خواہش نفسانی
کے وقت ایماندار کو یہ خیال ضرور آئیگا کہ آیا خدائے تعالےٰ نے اس کام کی اجازت
دی ہے یا نہیں اور جب اُسکو علم کے ذریعہ سے معلوم ہو جائیگا کہ اُسکی اجازت نہیں تو
ضرور اُس سے احتراز کرے گا - اِس طریقہ سے جتنے افعال قوائے شہویہ اور غضبیہ
سے متعلق ہیں سب کی اصلاح خود بخود ہو جائیگی کیونکہ آدمی کی طبیعت کا مقتضٰے ہے کہ جو
خیال اُسپر غالب ہو دوسرے خیال کو اثر کرنے سے روک دیتا ہے دیکھئے جب کسی
سے سخت خصومت ہوتی ہے تو ہرچند باقتضائے قوت غضبیہ بسا اوقات مخالف
کو قتل کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور اس خیال کو تائید دینے والے آلات و اسباب
بھی موجود ہوتے ہیں مگر اُس کے ساتھ ہی قصاص اور انتقام کا خیال اُس خیال سابق
پر ایسا غالب آجاتا ہے کہ آدمی قتل پر اقدام نہیں کر سکتا - اگر سلطنت کی طرف سے قصاص
و انتقام نہو تو معلوم نہیں روز کتنے واردات ہوا کریں - غرضکہ آدمی کو خیال سزا و انتقام
اکثر جرایم سے روک دیتا ہے اسیطرح قوائے شہویہ اور غضبیہ کے ناجائز تصرفات کے وقت
خیال انتقام اخروی ایماندار کو ارتکاب جرایم اور خلاف شرع امور سے ضرور روک دیگا جس سے
اصلاح تمدن خود بخود ہو جائے گی

یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب ایمان کا مقتضی یہ ہے تو چاہئے کہ کسی مسلمان سے ایسے افعال صادر نہوں جو مفسد تمدن ہوں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ بحث دوسری ہے اسکا تعلق اُن اشخاص سے ہے جن سے افعال صادر ہوتے ہیں ہمارا کلام یہاں نفس ایمان کے ذاتی مقتضی میں ہے سو بفضلہ تعالیٰ اہل انصاف سمجھ گئے ہوں گے کہ ایمان کا ذاتی مقتضیٰ اصلاح تمدن ہے جس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

اب ہم چند شہادتیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اصلاح تمدن میں کیسی حیرت انگیز تاثیریں ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور مہاجرین و انصار میں مسئلہ خلافت میں بحث شروع ہوئی تو انصار نے اس وجہ سے کہ ملک اُنہی کا تھا مہاجرین سے کہا کہ کم سے کم اتنا تو چاہیئے کہ ہم میں سے بھی ایک امیر ہو مگر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے پیشتر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے مقرر فرمایا تھا اب آپ میں سے کس کا نفس گوارا کرتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کرے اُنھوں نے کہا نعوذ باللہ ہم ہرگز اسکو گوارا نہیں کر سکتے چنانچہ اسی پر فیصلہ ہو گیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہو گئی۔

اب دیکھیے کہ اسلامی دنیا کی سلطنت صرف ایک بات پر ترک کر دینا خصوصاً ایسے موقع میں کہ ملک سابق سے اپنا ہی ہو گیا کوئی معمولی بات ہے۔ یہ ایمان کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کہ صرف اس بات پر کہ اپنے نبی نے جنکو نماز میں امام بنایا تھا انکی امامت کیوں کریں سلطنت چھوڑ دی اور اُس مہذب قوم میں کسی فرد بشر کی زبان پر یہ نہ آسکا کہ حضرت کجا خدمت پیش نمازی اور کجا سلطنت۔ ایمان اسے کہتے ہیں کہ اگر سلطنت ملتی ہو اور معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے

نبی کے خلاف مرضی ہے تو اُسکی خواہش میں ایک لفظ زبان سے نہ نکل سکے۔ اب غور کیا جائے کہ جس قوم کے قوای شہویہ اور غضبیہ کی تہذیب ایمان نے اس قسم کی کی ہو تو اُنکے اخلاق و عادات کی کیا کیفیت ہوگی اور اُس زمانہ کا تمدن کس اعلیٰ درجہ پر ترقی کیا ہوگا اور کیسا امن و امان قایم ہوا ہوگا۔ مولوی شبلی صاحب نے الفاروق میں لکھا ہے کہ جب اہل اسلام نے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اکثر مقامات شام کو فتح کر لیا تو قیصر کو نہایت غیرت آئی اور نہایت جوش کے ساتھ آمادہ ہوا کہ شاہنشاہی کا پورا زور عرب کے مقابلہ میں صرف کر دیا جائے۔ چنانچہ روم قسطنطنیہ جزیرہ اور ارمنہ کی اتنی فوجیں جمع کیں کہ انطاکیہ کے چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی فوجوں کا ٹڈی دل پھیلا ہوا تھا۔ جب ابو عبیدہ رضؓ کو اس باب میں متواتر خبریں پہنچیں اور یہ رائے قایم ہوئی کہ حمص چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں تو آپ نے حبیب ابن مسلمہ کو جو افسر خزانہ تھے بلا کر کہا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے اس معاوضہ میں لیا جاتا ہے کہ ہم اُنکو اُنکے دشمن سے بچا سکیں لیکن اسوقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم اُنکی حفاظت کا ذمہ نہیں اُٹھا سکتے اسلیئے جو کچھ اُن سے وصول ہوا ہے سب اُنکو واپس دیدو اور اُن سے کہدو کہ ہمکو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا اب بھی ہے لیکن چونکہ اسوقت تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اسلیئے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے تمکو واپس کیا جاتا ہے چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی کل واپس کر دی گئی عیسائیوں پر اس واقعہ کا اسقدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ خدا تمکو جلد واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا کہ انھوں نے کہا توریت کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا یہ کہکر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور

اور ہر جگہ چوکی پہرہ بٹھا دیا۔ ابو عبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا بلکہ جسقدر اضلاع فتح ہو چکے تھے ہر جگہ لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جس قدر رقم وصول ہوئی ہو واپس کردیجائے" دیکھیے اسلامی تمدن کا یہ اثر تھا کہ دشمنان اسلام مسلمانوں کے ہمدرد و خیرخواہ ہوگئے اور باوجودیکہ وہ قدیم سے عیسائی سلطنت تھی اور مذہبی جوش انکا ہنوز فرو نہیں ہوا تھا مگر حسن تمدن نے تھوڑے سے عرصہ میں انکو کسقدر گرویدہ بنالیا تھا کہ وہ دل سے مسلمانوں کے ہواخواہ بن گئے اور انکی مفارقت پر ایسا روتے تھے جیسے قدیم دوست کی جدائی پر کوئی روتا ہو۔

جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہوگئی اور لوازم تخت نشینی ادا کئے گئے یعنے مہاجرین اور انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو دوسرے روز آپ حسب عادت چادروں کا گٹھہ لئے ہوئے بازار کو چلے جارہے تھے راستہ میں عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا کہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ فرمایا بازار۔ کہا حضرت آپ خلیفۂ وقت اور تمام مسلمانوں کے بادشاہ ہوگئے ہیں اب آپکو اس کام سے کیا مناسبت فرمایا اگر میں تجارت ترک کردوں تو اپنے عیال کو کہاں سے کھلاؤں کہا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلیے وہ آپکے لئے کچھ مقرر کردیں گے چنانچہ دونوں صاحب انکے گھر گئے اور درخواست کی انہوں نے کہا میں ایک مہاجر شخص کا قوت آپ کے لئے مقرر کردیتا ہوں جو اس سے زیادہ نہ کم اور گرما و سرما کا لباس بھی آپکو دیا جائیگا بشرطیکہ جب وہ بوسیدہ ہوجائے تو واپس لادیں اور اُسکے معاوضہ میں نیا لیجائیں۔ پھر دونوں صاحبوں نے مشورہ سے روزانہ آدھی بکری انکے لئے مقرر کردی مگر اُس میں بھی بحث رہی کہ سر اور پیٹ کا سامان نہ دیا جائیگا آخر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُسی پر راضی ہوگئے۔

اب دیکھیے کہ خلیفۃ اللہ دولت اسلامی کے بادشاہ چادروں کا گٹھہ اُٹھائے ہوئے قوت

حلال کی طلب میں بازار جارہے ہیں پھر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے گھر اس غرض سے تشریف لیجارہے ہیں کہ اپنی اور اپنے عیال کی قوت بسری کیلئے کچھ مقرر کردیں اور مجال نہیں کہ اُنکے حکم کی مخالفت سرمو کریں صرف اس وجہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو امین ہذہ الامہ فرمایا تھا۔ پھر معمولی لباس اور خوراک کے مقرر کرنے میں بھی اقسام کی شرطیں لگائی جارہی ہیں۔ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین نے یہ بھی نہ کہا کہ آپ ہیں کون اور میرے مقابلہ میں آپکو حق ہی کیا۔ دیکھیے ایمان کا یہ اثر تھا کہ خلیفۂ وقت کو اپنے اقتداری امر میں تصرف کرنے سے روک کر اپنے محکوم شخص کے حکم کا محتاج بنادیا۔ جہاں بادشاہ کی یہ حالت ہو کہ رعایا کے حقوق سے اپنے حق کی زیادتی سرمو گوارا نہ ہو تو کیا ممکن ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی اور تعدی کرسکے۔



بشریٰ الکرام فی عمل المولد والقیام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

امابعد اولی الابصار واہل بصیرت پر پوشیدہ نہیں کہ جب آفتاب جہانتاب عالم کو اپنے نور سے معمور کرنا چاہتا ہے تو قبل طلوع طرب وسرور کا ایک بیش بہا سامان مہیا ہوجاتا ہے۔ جدہر دیکھیے دلربایانہ انداز ہے۔ اور فرحت وسرور دمساز۔ صحرا کا خوشنما منظر دل کو وسعت آباد بنا دیتا ہے۔ وحشت خیز پہاڑوں کا سماں بھی دلوں کو لبھانے لگتا ہے۔ نسیم کی مستانہ خیز رفتار ہر شاخ وبرگ کو وجد میں لاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا دمبدم قالب میں جان تازہ پھونکتی جاتی ہے۔ تاریکی شب نے جو اس کو تیرہ وتار بنا دیا تھا نورانیت فضا انکو پھر نورانی بناتی ہے۔ طیور کے نغمات افسردہ دلوں کو غنچہ کی طرح کھلاتے ہیں۔ وحوش کی گرم جولانیاں دیکھکر غصہ وفکر دور ہو جاتے ہیں۔ غم ظلمت شب کے ساتھ منور اور دل سرور سے معمور ہوتا ہے یہ سب فیضان اُس نور کا ہے جو آفتاب عالمتاب کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق رکھتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ جب اجسام کے روشن کرنیوالے

آفتاب سے اسقدر فرحت ومسرت ہر طرف جوش زن ہو تو آفتاب روحانی کے قدوم میمنت لزوم سے کسقدر فرحت وسرور کا جوش ہونا چاہیے۔ دیکھیے مبدأ کائنات سرور موجودات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انا من نور اللہ وکل شئ من نوری یعنے میں اللہ کے نور سے بنا اور ہر چیز میرے نور سے پیدا ہوئی وہی نور ہے جسکی طرف اس آیہ شریف میں اشارہ ہے۔ اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح اور ارشاد ہے قد جاءکم من اللہ نور یہی مقدس نور ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی پیشانی میں آیا انکو مسجود ملائک بنایا یہ وہ نور ہے کہ ساکنان ظلمت کدۂ عدم کو اس قابل بنایا کہ انوار وجود کا اقتباس کرسکیں۔

اب[ع] سنیے کہ اس معنوی اور اصلی نور کے طلوع کے وقت عالم غیب وشہادت میں کسقدر اہتمام ہوا تھا حضرت آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت کی ولادت باسعادت کے وقت مجھسے ایک ایسا نور نکلا کہ اُس سے تمام عالم منور ہو گیا۔ چنانچہ شام کے مکانات مجھے نظر آنے لگے۔

عثمان ابن ابی العاص کی والدہ جو میلاد شریف کی رات حضرت آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا کی خدمت میں حاضر تھیں بیان کرتی ہیں کہ قبل ولادت شریف گھر میں جدھر میں نظر ڈالتی تھی نور ہی نور نظر آتا تھا اور اُسوقت ستاروں کی یہ کیفیت محسوس ہوئی تھی کہ گویا وہ اس مکان پر ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔

شفا رضی اللہ تعالی عنہا عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ اُس نور سے مجھے اسقدر انکشاف ہوا کہ مشرق او رمغرب تک میری نظر پہنچنے لگی اور روم

ع۵ مواہب لدنیہ اور شفاے قاضی عیاض وخصائص کبری وغیرہ معتبر کتابوں سے یہ روایتیں لکھی گئی ہیں ۱۲

کے مکانات میں نے دیکھے۔ ہر چند یہ نور جسکی خبریں دی گئیں ظاہرا نور ہی تھا مگر اسکی حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ بصارت کو ہمرنگ بصیرت کرکے کل جسمانی ظلمات کو منور کر دینا معمولی نور کا کام نہیں یہ آفتاب کا نور تھا کہ اجسام کی سطح بالائی پر بیٹھ جاتا بلکہ یہ اُس ذات مقدس کا نور تھا جو انما من نور اللہ کی مصداق ہے یہ نور اجسام کے اندر سرایت کئے ہوئے تھا۔ غرضکہ اُس روز عالم میں ایک خاص قسم کی روشنی ہوئی تھی جسکے ادراک میں عقل خیرہ ہے۔ اور اس روز ملائکہ کو حکم ہوا تھا کہ تمام آسمانوں کے اور تمام جنتوں کے دروازے کھول دیں اور زمین پر حاضر ہو جائیں۔ چنانچہ کل ملائکہ کمال مسرت سے زمین پر اُتر آئے۔

اُس روز نہر کوثر پر ستر ہزار خوشبو کے جھاڑ نصب کئے گئے تھے جنکا ثمر اہل جنت کیلئے بخور بنایا جائیگا۔ اس واقعہ کی یادگار میں ہر آسمان پر ایک ستون زمرد کا اور ایک ستون یاقوت کا نصب کیا گیا۔ اُس رات میں شیاطین مقید کئے گئے۔ کاہنوں کی خبریں بند ہو گئیں سارے جہان کے بُت سر بسجود ہو گئے۔ فارس کے آتشکدے جنکی پرستش ہزار سال سے ہوتی تھی بجھ گئی۔ ماہران نجوم ہر طرف خبریں دینے لگے کہ آج نبی آخر الزمان کا ستارہ طلوع ہوا اور قوم بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی اب عرب و عجم نبی آخر الزمان کے مطیع او فرماں بردار ہو جائینگے۔

اُس رات بادشاہوں کے تخت نگونسار ہو گئے۔ ایوان کسریٰ کو زلزلہ ہوا جس سے چودہ کنگرے اسکے گر گئے زبان اشارت یہ کہہ رہی تھی کہ بادشاہ وقت کے چودہ پشت تک سلطنت رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چودھویں پشت کے بعد ملک کسریٰ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

غرضکہ اس مبارک رات میں اس قسم کے بہت سے قدرتی اہتمام ایسے ظہور میں آئے

کہ جسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ہی ایسی تھی کیونکہ آپ باعث ایجاد عالم و آدم ہیں جیسا کہ لولاک لما خلقت الافلاک اور لولاک لما خلقتک سے ظاہر ہے۔

نبوۃ جو سلطنت خدائی میں اعلیٰ درجہ کا منصب ہے اسکا سلسلہ آپ ہی سے شروع ہوا جیسا کہ حضرت فرماتے ہیں کنت نبیاً وآدم بین الماء والطین۔ اور ایک روایت میں ہے کنت نبیاً وآدم بین الروح والجسد یعنے میں اُسوقت نبی تھا کہ آدم علیہ السلام ہنوز پیدا نہیں ہوئے تھے پھر انبیا گویا آپکے امتی بنائے گئے کیونکہ آپ پر ایمان لانے کا صرف حکم ہی نہیں بلکہ نہایت شد و مد سے اقرار لیا گیا۔ کما قال اللہ واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علی ذالکم اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشاھدین

یعنے جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا کہ جو کچھ میں نے تمکو دیا کتاب اور علم پھر آوے تم پاس رسول جو سچ بتاوے اُسکو جو تمہارے پاس ہے تو البتہ ایمان لائیو اُسپر اور البتہ مدد دیجیو اسکو فرمایا۔ کیا تم نے اقرار کیا اور لیا تم نے اسپر بھاری عہد میرا۔ کہا انہوں نے اقرار کیا ہمنے۔ فرمایا تو اب شاہد ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ شاہد ہوں انتہیٰ

اس سے ظاہرا تمام انبیا کا حضرت کے امتی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسیوجہ کل انبیا قیامت میں حضرت کے جھنڈے کے نیچے رہیں گے۔ اور شب معراج حضرت کی شان تمام انبیا کو بتلادی گئی۔ چنانچہ سب کے امام آپ ہی بنائے گئے اور سب نے آپ کی اقتدا کی کل انبیا کا یہ حال ہو تو انکی امتوں کے امتی ہونے میں کیا تامل۔ اسیوجہ سے فرماتے

ہیں۔ بعثت الی الناس کافۃ یعنی کل انسانوں کی طرف میں مبعوث ہوا ہوں۔ اور حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا یعنے ہمنے تمکو سب آدمیوں کے واسطے بھیجا۔ خوشی اور ڈر سنانے کو۔ ہرچند معنوی طور پر موسیٰ علیہ السلام حضرت کی امت میں داخل تھے مگر جب توریت میں حضرت کی خاص امت کے فضائل پر مطلع ہوئے تو دعا کی کہ ظاہری طور پر بھی حضرت کی امت میں داخل ہوں۔ عالم ملکوت میں آپکی نام آوری اور شہرت کیلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ کہ حق تعالےٰ نے اپنے نام مبارک کے ساتھ آپ کا نام نامی یعنے محمد رسول اللہ عرش پر اور ہر ایک آسمان میں جگہ جگہ اور جنت کے جھاڑوں اور طوبیٰ اور سدرۃ المنتہےٰ کے ہر ایک پتے پر اور حوروں کے سینوں اور فرشتوں کے جبینوں پر لکھا۔ جب تک کہ آدم علیہ السلام نے حضرت کیواسطے سے یہ کہکر دعا نہ کی کہ یارب بحق محمد لما غفرت لی معافی نہوئی۔

یہ اور اسکے سوا بہت سی روایتیں الخصائص الکبریٰ۔ اور النہجۃ السویہ اور مواہب لدنیہ اور شفا قاضی عیاض وغیرہ میں مذکور ہیں جنسے ثابت ہے کہ حضرت کا نام مبارک محمد (صلی اللہ وسلم علی مسماہ) تمام عالم ملکوت والسموات میں لکھا ہوا ہے۔ مقصود اس سے ظاہر ہے کہ اہل ملکوت وغیرہم معلوم کرلیں کہ تمام عالم میں حضرت سے زیادہ کوئی اللہ تعالیٰ کا محبوب نہیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے یہی خیال کرکے حضرتؐ کے نام کے وسیلہ سے مغفرت چاہی۔

اب یہ دیکھیے کہ یہ نام مبارک حضرتؐ کے لئے کیوں تجویز فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو حمد نہایت محبوب اور مرغوب ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے اسیوجہ سے قرآن شریف کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے ہے جسکے معنی یہ ہیں ہر طرح کی حمد خدا ہی کو

سزاوار ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اور نماز جو تمام عبادتوں میں اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اسکی ابتدا بلکہ ہر رکعت کی ابتدا میں الحمد پڑہنے کا حکم ہے۔ اور اہل ایمان جب جنت میں جائینگے حمد کرتے ہوئے جائینگے کما قال اللہ تعالیٰ و آخر دعوٰہم ان الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی آخر پکارنا انکا یہ ہے کہ سب تعریف واسطے اللہ کے ہے جو پروردگار سارے جہان کا ہے۔ انتہیٰ۔

اب دیکھئے کہ تمام حمد جب حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں جنکا مطلب یہ ہوا کہ سب حامد ہیں۔ اور حق تعالیٰ محمود ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کے محمدؐ یعنے حمد کردہ شدہ ہونے میں کیا تامل۔ باوجود اسکے یہ پیارا لقب حق تعالیٰ نے ازل سے حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص فرمایا اور ابتدائی تکوین عالم سے عالم ملکوت میں اُسکی شہرت دی تاکہ اہل ملکوت پر منکشف ہوجائے کہ جس لفظ کے معنی کا مصداق جناب باری ہو وہ لفظ جنکے لئے تجویز کیا گیا وہ ضرور ایسے ہونگے کہ عالم میں انکا نظیر نہوگا۔ اس سے بکمال وضاحت یہ بات ثابت ہوگئی کہ عالم میں حضرت کا مثل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اب ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا شخص ازل سے محمدؐ ہوسکے۔ اور اس سے یہ بھی صاف طور پر معلوم ہوا کہ جتنی تعریف و توصیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیجائے وہ باعث خوشنودی الٰہی ہے کیونکہ اس لقب کے عطا کرنے سے اور کیا مقصود ہوسکتا ہے۔ اسیوجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشعار نعتیہ سے خوش ہوتے تھے۔ جسکا منشا خوشنودی الٰہی تھا۔ النہجۃ السویہ میں لکھا ہے کہ حضرت کی امت کا لقب کتب سابقہ میں حمادین ہے تعجب نہیں کہ اس لقب سے اس طرف بھی اشارہ ہو کہ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وہ کثرت سے کریں گے۔ اگرچہ حضرتؐ کے بہت سارے نام ہیں مگر چونکہ یہ پیارا نام حق تعالیٰ کو

نہایت محبوب ہے اسلئے ایمان سے اُسکو کمال درجہ کا تعلق ہے۔ چنانچہ النبھجۃ السنیۃ
میں لکھا ہے کہ کافر جب تک محمد رسول اللہ نہ کہے اُسکا ایمان صحیح نہیں۔ اور بجائے
اُسکے احمد کہنا کافی نہیں ہو سکتا۔ اسمیں سر یہی ہے کہ ایمان لانے ہی کے وقت آدمی
سمجھ جائے کہ حضرت قابل حمد و ثنا ہیں اور حمد زبان اور دل سے کیا کرے۔ اور اسی
میں بیہقی کی روایت نقل کی ہے کہ ایک جگہ محدثین کا مجمع تھا یہ مسئلہ پیش ہوا کہ عرب کے
اشعار میں کونسا شعر عمدہ ہے۔ سب کا اتفاق حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس
شعر پر ہوا ؎

وشق لہ من اسمہ لیجلہٗ   فذو العرش محمود وہذا محمد

یعنے حق تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان تبلانے کے لیے اُنکا نام اپنے
نام سے مشتق کیا چنانچہ حق تعالیٰ محمود ہے اور ہمارے نبی کریم محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)
چونکہ لفظ محمد کے معنی میں کمال درجہ کی جلالت شان معلوم ہوتی ہے جیسا کہ حسان بن ثابت
رضی اللہ عنہ کے شعر سے بھی ظاہر ہے۔ اسلئے ابن معلی نے اُسکے فہم معنی میں متحیر ہو کر یہ
تجویز کی کہ وہ علم مرتجل[۵] ہے۔ مگر النبھجۃ السویہ میں لکھا ہے کہ علما نے اُسکی غلطی ثابت کی
اور کہا کہ وہ منقول از باب تفعیل سے اسم مفعول ہے جسکے معنی حمد کردہ شدہ ہیں۔ اور
صحاح میں لکھا ہے کہ المحمد الذی کثرت خصالہ المحمودۃ انتہیٰ۔ غرضکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ازل سے ہر یک موطن و مقام میں ممتاز اور محمد ہے۔ النبھجۃ السویۃ میں لکھا ہے کہ جس رات

---

۵ ؎ علم مرتجل اسکو کہتے ہیں کہ لفظ بغیر مناسبت کے دوسرے معنے میں نقل کیا جائے جیسے جعفر کہ
نہر کیلئے موضوع تھا اور بعد کسی کا علم رکھا گیا اور منقول اسکو کہتے ہیں کہ نقل کے وقت معنے سابق کی
مناسبت ملحوظ ہو۔ ۱۲

آپ پیدا ہوئے ملائکہ آپکو خلیفۃ اللہ کہتے تھے۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے ملائکہ سے آدم
علیہ السلام کے باب میں فرمایا تھا انی جاعل فی الارض خلیفۃ جس سے ظاہر ہے
کہ انکی خلافت صرف زمین سے متعلق تھی۔ لیکن فرشتے چونکہ افلاک وغیرہ میں دیکھتے
تھے کہ حضرت کا نام مبارک حق تعالیٰ کے نام مقدس کے ساتھ ہر جگہ مکتوب ہے۔ اس لئے
انہوں نے اُنکو علی الاطلاق خلیفۃ اللہ کہدیا۔ اور فی الارض کی قید جو آدم علیہ السلام کی خلافت
میں ملحوظ تھی نہیں لگائی فرشتوں کی اس گواہی سے ثابت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کل ملکوت میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ اسیوجہ سے تمام آسمانوں کے ملائک اس خلیفۃ اللہ
کے سلام کے لئے روز میلاد حاضر ہوئے جن کا نزول اجلال تمام عالم کے حق میں رحمت
تھا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین جب آپ
رحمت مجسم ہو کر اس عالم میں تشریف لائے تو کون ایسا شقی ہوگا کہ نزول رحمت سے خوش
نہو۔ روایت ہے کہ تمام عالم میں اُس روز ہر طرف خوشی تھی مگر شیطان کو کمال درجہ کا غم تھا
جس سے زار زار روتا تھا۔ جبرئیل علیہ السلام اُسکی یہ حالت دیکھ کر رہ نہ سکے اور ایک ایسی
ٹھوکر اسکو ماری کہ عدن میں جا پڑا۔ غرضکہ جسطرح میلاد شریف کا غم کمال شقاوت کی دلیل
ہے اُسکی مسرت کمال سعادت کی دلیل ہوگی۔ جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے جو کنز العمال
وغیرہ میں مذکور ہے کہ ابو لہب کو جب ثویبہ نے جو اُسکی لونڈی تھی خبر دی کہ تمہارے بھائی
عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے گھر لڑکا پیدا ہوا اُسکو اس خبر فرحت اثر سے نہایت خوشی ہوئی اور اس
بشارت کے صلہ میں اُسکو آزاد کر دیا۔ ابو لہب کے مرنے بعد کسی نے اُسکو خواب میں دیکھا
اور حال دریافت کیا تو اُس نے اپنے معذب ہونے کا حال بیان کر کے کہا کہ ہر دوشنبہ کی رات
اُس خوشی کے صلہ میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے میں ہوئی تھی مجھ سے عذاب

کی تخفیف ہوجاتی ہے اور میری اونگلیوں سے پانی نکلتا ہے جسکو چوسنے سے تسکین ہوتی ہے۔ دیکھیے جب ایسا ازلی شقی جسکی مذمت میں ایک کامل سورہ تبت یدا ابی لھب نازل ہے میلاد شریف کی مسرت ظاہر کرنے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی رحمت کا مستحق ہوا اور وہ بھی کہاں عین دوزخ میں تو خیال کیا جائے کہ حضرتؐ کے امتیوں کو اس اظہار مسرت کے صلہ میں کیسی کیسی سرفرازیاں ہونگی۔ اسی مضمون کو حافظ شمس محمد بن ناصر الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں لکھا ہے

اذا کان ہذا کافرا جاء ذمہ — وتبت یداہ فی الجحیم مخلدا
اتی انہ فی یوم الاثنین دائما — یخفف منہ للسرور باحمدا
فما الظن بالعبد الذی کان عمرہ — باحمد مسرورا ومات موحدا

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چند ولادت شریف ایک معین دوشنبہ کے روز ہوئی مگر اُسکا اثر ہر دوشنبہ میں مستمر ہے اِس لحاظ سے اگر ہر دوشنبہ اظہار مسرت کے لئے خاص کیا جائے تو بے موقع نہوگا۔

کم سے کم سال میں ایک بار تو اظہار مسرت ہونا چاہئے اسی وجہ سے حرمین شریفین میں روز دوازدہم شریف نہایت اہتمام سے ہوتا ہے یہانتک کہ اُس روز اور عیدوں کی طرح خطبہ پڑھا جاتا ہے اور تمام مسلمان خوشیاں مناتے ہیں خصوصاً مدینہ طیبہ میں تو دور دور سے قافلے پر قافلے چلے آتے ہیں اور مراسم عید ادا کیے جاتے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں ایک لطف خاص قابل دید یہ ہے کہ ہر فرقے اور حرفے کے لوگ مسجد الحرام سے قبہ مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جوق جوق ممتاز ہوکر جاتے ہیں۔ اور وہاں مولود شریف پڑھکر شیرنی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔ اور مصداق ما راٰہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن مورد تحسین ہوتے ہیں۔ شیخ نجم الدین

غیطی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ مولود شریف میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور ابتداے نبوت اور ہجرت اور مدینہ شریف میں داخل ہونا اور وفات شریف یہ سب امور دوشنبہ کے روز واقع ہوے حضرتؐ کے معاملات میں یہ ایسا روز ہے جیسے آدم علیہ السلام کے حق میں جمعہ تھا کہ انکی پیدائش زمین پر اُترنا۔ توبہ کا قبول ہونا۔ اور وفات سب جمعہ کے دن ہوے۔ اس وجہ سے ایک ساعت جمعہ میں ایسی ہے کہ جو دعا اُسمیں کیجائے قبول ہوتی ہے تو خیال کرو کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ساعت ولادت میں اگر دعا قبول ہو تو کونسی تعجب کی بات ہوگی انتہی

علما نے اختلاف کیا ہے کہ میلاد شریف کی رات افضل ہے یا شب قدر جن حضرات نے میلاد شریف کی رات کو افضل کہا ہے اُنکے دلائل یہ ہیں کہ لیلۃ القدر کی فضیلت اسوجہ سے ہے کہ ملائکہ اسمیں اُترتے ہیں جیسا کہ خداے تعالیٰ فرماتا ہے لیلۃ القدر خیر من الف شہر تنزل الملائکۃ والروح فیھا اور شب میلاد میں سید الملائکۃ والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول اجلال اس عالم میں ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ فضیلت شب قدر میں نہیں آسکتی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شب قدر حضرتؐ کو دی گئی اور شب میلاد میں خود حضرتؐ کا ظہور ہوا انکی وجہ سے شب قدر کو فضیلت حاصل ہوئی اور ظاہر ہے کہ جو چیز ذات سے متعلق ہو بہ نسبت اُس چیز کے جو عطا کی گئی افضل ہوگی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت صرف حضرتؐ کی امت سے تعلق ہے اوروں کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور شب میلاد تمام موجودات کے حق میں نعمت ہے اسلئے کہ اسمیں رحمۃ للعالمین کا ظہور ہے جو کل موجودات کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے۔

یہ بات دوسری ہے کہ جسطرح ابولہب کے حق میں ہر دوشنبہ کی رات میں برکت مکرر

ہوتی ہے ہر دوشنبہ کی رات یا ہر تاریخ ولادت کی رات میں وہ فضیلت مکرر ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ نفس شب قدر سے شب میلاد افضل ہے۔

اب مولود شریف کے جواز اور استحباب کی دلیلیں سنئے۔ نجم الدین غیطی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر سال مولود شریف معین روز میں کرنے کی اصل بخاری اور مسلم کی روایت سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے دیکھا کہ یہود عاشورہ کے روز روزہ رکھا کرتے ہیں۔ اسکی وجہ اُن سے دریافت کی انہوں نے کہا کہ یہ روزہ ہے کہ اسمیں خدائے تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی۔ اسلئے اسکے شکریہ میں عاشورہ کے روز ہم لوگ روزہ رکھا کرتے ہیں آپ نے فرمایا نحن احق بموسیٰ منکم یعنے تم سے زیادہ ہم اسکے مستحق ہیں۔ چنانچہ آپ نے بھی اس روز روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی اسکا حکم فرمایا! اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی اعلیٰ درجہ کی نعمت کسی معین روز میں حاصل ہوئی ہو اُسکی ادائے شکر اوس روز کے نظیروں میں کرنا مسنون ہے اور چونکہ کوئی نعمت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے افضل نہیں ہوسکتی اسلئے بہتر ہے کہ اس شکریہ میں اقسام کی عبادتیں مثل صدقات اور اطعام طعام وغیرہ روز میلاد شریف ادا کی جائیں۔ انتھیٰ۔ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے پیشتر حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسکے قریب قریب جواز مولود پر استدلال کیا ہے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دوسری اصل مولود شریف کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفس نفیس اپنا عقیقہ ادا فرمایا باوجودیکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ کے جد امجد عبد المطلب نے ساتویں روز آپ کا عقیقہ کیا تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ عقیقہ دوبارہ نہیں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت کو اس اعادہ عقیقہ سے یہ معلوم کرنا منظور

تھا کہ اعلیٰ درجہ کی نعمت پر اگر اعادہ شکر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس لئے میلاد شریف کے روز اظہار شکر میں کھانا کھلانا اور اظہار مسرت کرنا مستحب ہے انتھیٰ۔

رسالہ اتمام النعمۃ الکبریٰ علی العالم بمولد المصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں حافظ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ مولود شریف کی اصل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہے۔ مولود کی فضیلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس میں ارغام شیطان اور سرور اہل ایمان ہے انتھیٰ۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان علماء کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ جس سے اُس کا مسنون اور مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے صوم عاشورہ سے جو استدلال کیا ہے اسمیں غور کیجئے کہ باوجودیکہ موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی ایک معین عاشورہ میں ہوئی تھی۔ مگر تمام سال کے ایام میں صرف اُسی روز کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نعمت کا شکریہ اسی روز مکرر ہر سال ادا کیا جائے جس سے ثابت ہے کہ گو واقعہ مکرر نہیں مگر اُسکی برکت کا اعادہ ضرور ہوتا ہے جس پر دلیل یہ ہے کہ ہر دوشنبہ میں ابولہب کیلئے اسکی برکت کا اعادہ ہوتا ہے۔

بعضے علماء نے یہاں پر یہ کلام کیا ہے کہ صوم عاشورہ منسوخ ہوگیا ہے اسلئے اس کی فضیلت باقی نہیں رہی۔ اسکا جواب یہ ہے کہ رمضان شریف کے روزوں کی فرضیت کے بعد اب کسی روزہ کی فرضیت نہ رہی اس سے صوم عاشورہ کی علت جو حضرت کے پیش نظر تھی اُسمیں کوئی فرق نہیں آیا اسلئے کہ اسکے منسوخ کرنے کے وقت حضرت نے یہ نہیں فرمایا کہ نحن لسنا احق بموسیٰ منکم جیسا کہ روزہ رکھنے کے وقت نحن احق بموسیٰ منکم فرمایا تھا اور یہ فرمایا

کہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ گزر کر ایک زمانہ ہو گیا۔ ہر سال اُسکا لحاظ رکھنا جائز نہیں کیونکہ اسمیں اعادہ معدوم نظر آتا ہے۔ پھر باوجود اُس روزے کے منسوخ ہونے کے احادیث میں اُسکے فضائل وارد ہیں جس سے ثابت ہے کہ روزے کا حکم فرمانے کے وقت جو فضیلت ملحوظ تھی وہ اب بھی ملحوظ ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ فضائل منسوخ نہیں ہو سکتے اسلئے شیخ الاسلام ؒ کے استدلال پر اسکے منسوخ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اُس روزہ کی فضیلت بھی منسوخ ہو گئی تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ اسلئے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی بیحد خوشی اگر ہو تو اُن لوگوں کو ہو گی جن کو اُن کے امتی ہونے کا دعویٰ تھا یعنے یہود کو ہمیں اُسکی کیا ضرورت اگر انبیائے سابق کے اس قسم کے واقعات کی خوشی ہم پر لازم ہو تو ہفتہ کے تمام ایام انہی خوشیوں میں صرف ہو جائیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس روزہ سے صرف امت کو توجہ دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم ایک نبی کی نجات پر شکریہ ادا کرتے ہیں تو تمکو ہماری ولادت کی بیحد خوشی کرنی چاہئے۔ مگر طبع غیور کو صراحتاً یہ فرمانا گوارا نہ تھا کہ ہمارے میلاد کے روز تم لوگ روزہ رکھا کرو بلکہ خود ہی اِس شکریہ میں روز دوشنبہ ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور اُس کی وجہ اُس وقت تک نہیں بتائی کہ کسی نے نہیں پوچھا اسلئے کہ بغیر استفسار کے بیان کرنا بھی طبع غیور کے مناسب حال نہ تھا۔ یہ بات مسلم شریف کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ جب حضرت ؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپ دوشنبہ کا روزہ کیوں رکھا کرتے ہیں فرمایا کہ وہ میری ولادت کا روز ہے اور اُس روز مجھ پر قرآن نازل ہوا۔ انتہیٰ۔ اب غور کیجئے کہ جب خود بدولت ہمیشہ روز میلاد میں شکریہ کا روزہ رکھا کرتے تھے تو ہم لوگوں کو کسقدر اِس شکریہ کی ضرورت ہے اِس لئے کہ حضرت کا وجود ہم

لوگوں کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے اور اگر یہی لحاظ ہوتا کہ اپنی ولادت کا شکریہ ضرور تھا تو فرما دیتے کہ ہر شخص اپنی ولادت کے روز شکریہ کا روزہ رکھا کرے حالانکہ کسی روایت میں یہ وارد نہیں ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس میں عمومی نعمت کا لحاظ تھا اور اُس سے صرف تعلیم امت مقصود تھی کہ اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ہر ہفتہ میں ادا کیا جائے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ملا علی قاری ؒ نے طیبی ؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس عالم میں ہوا اور کتاب عنایت ہوئی تو روزہ کے لئے اُس روز سے بہتر کونسا روز ہو سکتا ہے۔ غرضکہ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ میلاد مبارک کا شکریہ ہر ہفتہ میں ادا کیا جائے پھر اگر سال میں بھی ایک بار اِس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو کسقدر بدنصیبی اور بے قدری ہے۔ غرضکہ تکرار زمانے میں گو اعادہ معدوم نہیں مگر ابتدائی فضیلت اُس میں ضرور ملحوظ ہوتی ہے۔ دیکھئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب مذبوح ہونے سے بچائے گئے جسکے سبب سے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو خوشی ہوئی ہر سال اس خوشی کا اعادہ ہوا کرتا ہے۔ اِس سے بڑھکر کیا ہو کہ اُس دن عید ہوتی ہے اور اس واقعہ کے پیش نظر ہو جانے کیلئے جس قسم کے افعال و حرکات اُن حضرات اور حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے صادر ہوئے اسی قسم کے حرکات کے ہم لوگ حج میں مامور ہیں۔ چنانچہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پانی کی تلاش میں صفا و مروہ میں سات چکر کئے تھے۔ ہم کو بھی حکم ہے کہ اس وسیع میدان میں سات چکر کیا کریں۔ میلین اخضرین کے مقام میں وہ دوڑی تھیں ہمیں بھی وہاں دوڑنے کا حکم ہے اسیطرح اور بہت سے افعال ہیں جن سے وہ اصلی واقعہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اب اگر مولود شریف کے وقت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف فرمائی مسلمانوں کے پیش نظر

ہو اور تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں تو ایسی کونسی بے موقع حرکت ہوگی جس سے
لعن وطعن کیا جاتا ہے اور اقسام کے الزام لگائے جاتے ہیں کہ یہ لوگ حضرتؑ
کے بار بار پیدا ہونے کے قائل ہیں ہم پوچھتے ہیں کیا حجاج ہونیہ کو ذبح کرنے کے
وقت اسمٰعیل علیہ السلام کے بار بار ذبح کرنے کا خیال کرتے ہیں۔
حالانکہ یہ گویا حکایت اُسی کی ہے۔

بخاری شریف کی کتاب الانبیاء میں روایت ہے جسکا ملخص یہ ہے کہ سفر غزوہ
تبوک میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر مقام حجر پر ہوا تو حضرت کو بذریعہ وحی وہاں
کے حالات پر اطلاع ہوئی اور فرمایا کہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی فلاں کوئیں کا پانی پیا
کرتی تھی۔ قوم نے اُسکو اسیوجہ سے قتل کر ڈالا کہ وہ ایک روز سب پانی پی جاتی تھی
حضرت صالح علیہ السلام نے بہتیرا منع کیا مگر انہوں نے نہ مانا اس پر عذاب نازل
ہوا اور وہ سب ہلاک کئے گئے۔ اب تم لوگ اُس کوئیں پر اترو جو اونٹنی کے لئے
خاص تھا۔ اور دوسرے کوئیں کے پانی سے احتراز کرو صحابہ نے عرض کیا کہ ہم
تو اس کوئیں کے پانی سے آٹا گوندھ لئے ہے فرمایا وہ خمیر اور بچا ہوا پانی سب پھینکدو اور
اُس کوئیں کا پانی لو جو اونٹنی کے لئے خاص تھا۔ پھر فرمایا کہ اُس قوم کی سکونت گاہ میں
جب پہونچو تو روتے ہوئے وہاں سے جلد گزر جاؤ۔ اور اگر رونا نہ آئے تو بتکلف
روؤ۔ اس خوف سے کہ کہیں تم پر انکا عذاب نہ آجائے۔ چنانچہ جب اُس قوم کے
مکانات پر پہونچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر سے اپنا سر مبارک ڈھانک
لیا اور اونٹنی کو دوڑایا یہانتک کہ اُس وادی سے نکل گئے (یہ خلاصہ اُن روایتوں
کا ہے جو بخاری اور فتح الباری اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مذکور ہیں) اسیطرح مسلم وغیرہ

کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حج میں وادی محسر جہاں اصحاب فیل ہلاک ہوئے
تھے وہاں سے جلد گزر جانا مسنون ہے۔ اب غور کیجئے کہ حضرتؐ پر اُس مقام میں جو خوف
طاری ہوا اور سب کو رونے کا حکم فرمایا اور آپ بھی نہایت تواضع کی حالت میں چادر
مبارک سے سر ڈھانکے ہوئے نہایت جلدی سے اُس مقام سے نکل گئے کیا یہ
خیال ہو سکتا ہے کہ اُن برگزیدگان حق پر اُسوقت سچ مچ عذاب اُترتا وہ بھی ایسی
حالت میں کہ صرف خوشنودی خدا اور رسول کی غرض سے راہ خدا میں جان دینے کو چلے
جارہے ہیں۔ اور تنہا یہی نہیں بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے جنکی
شان میں وارد ہے ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم یعنے
خدائے تعالیٰ اُن لوگوں پر عذاب نہیں کرتا جن میں آپ ہیں پھر حضرتؐ کو اُس خوف
سے کیا تعلق جو خود بھی جلدی سے وہاں سے گزر گئے کیا کوئی ضعیف الایمان بھی
اس موقعہ میں ناشائستہ خیال کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ پھر یہ تمام آثار جو اصلی واقعہ کے
وجود کے وقت مرتب ہونے کے لائق ہیں اسوقت کیوں ظہور میں آئے کیا اُسوقت
ابھی قوم پر عذاب اتر رہا تھا جسکے دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص بے باکانہ
اُس مقام میں چلا جائے تو اندیشہ ہے کہ مبتلائے عذاب ہو جائے اس لئے کمال خضوع سے
روتے ہوئے جانے کی ضرورت ہوئی تاکہ خدائے تعالیٰ اِس عذاب سے بچالے اس سوال کا
جواب سوائے اِسکے کچھ نہیں کہ صرف اصلی واقعہ اُسوقت پیش نظر ہو گیا تھا۔ جسپر آثار خوف
مرتب ہوئے۔ پھر یہ حضرتؐ نے اپنی رائے سے بھی نہیں فرمایا اسلئے کہ اُس ویران مقام میں کیونکر
معلوم ہو کہ اونٹنی کا کنواں کونسا اور قوم کے کوئیں کونسی ہیں جن سے پانی لینے کی ممانعت ہوئی
بلکہ یہ سب وحی سے معلوم ہونیکی باتیں ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ سب تعلیم الٰہی تھی۔ اب فرمائے کہ حضرت

جو صرف اصل واقعہ کے پیش نظر ہونے سے حکم تھا کہ خوف وخضوع ظاہر کریں۔ اسیطرح میلاد شریف کے پیش نظر ہونے کے وقت آثار فرحت وتعظیم ظاہر کئے جائیں تو خدا اور رسول کی مرضی کے مخالف ہونے کی کیا وجہ کیا یہ حدیث صحیح نہیں ہے کہ صحابہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا قوموا لسیدکم۔ غرضکہ یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ میلاد شریف کے وقت جو قیام کیا جاتا ہے وہ شرک یا مکروہ ہے۔

تخئیل اور تصور پر آثار کا مرتب ہونا فطرت انسانی میں داخل ہے جیسے کسی خوشی کے واقعہ کے خیال کرنے پر آثار بشاشت چہرہ سے نمایاں ہوتے ہیں اور غم کا واقعہ یاد کرنے سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ کنز العمال میں روایت ہے کہ ایک روز عمر رض نے صبح کی نماز میں سورۂ یوسف شروع کی جب اس آیت پر پہونچے وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم جسمیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے غم وبکا کا ذکر ہے آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ آگے بڑھ نہ سکے آخر رکوع کر دیا۔ شریعت میں بھی اس تخئیل اور تصور کا اعتبار اور لحاظ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جامع الصغیر میں اس مضمون کی حدیثیں مذکور ہیں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی کا نام محمد رکھو تو اُس کا اکرام کرو اور اُس کو بُرا مت کہو اور اذیت نہ پہنچاؤ۔ دیکھئے نام جو صرف الفاظ ہیں ان میں یہ اثر کہاں سے آگیا کہ اپنے مسمّی کو ایسی عزت بخشے۔ دراصل یہ اُس تخئیل کا اثر ہے جو اس لفظ کی تذکر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پیش نظر ہو جاتی ہے۔ یہ بحث کسی قدر بسط سے ہم نے انوار احمدی میں لکھی ہے۔

فتح الباری میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حج میں جو تلبیہ یعنے لبیک کہا جاتا ہے اسکی وجہ احادیث میں یہ وارد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا واذن فی الناس بالحج یعنے لوگوں میں پکار دو کہ حج کیلئے آئیں چنانچہ اُنھوں نے پکار دیا۔ اب جو لبیک، کہا جاتا ہے اُسی کا جواب ہے دیکھئے یہ لبیک حالت احرام میں کس خضوع اور خشوع سے کہا جاتا ہے۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کے روبرو بھی یہ جواب دیا جاتا تو اس سے زیادہ تواضع نہوتی۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نے جو بلایا تھا اُسکو ہزار سال گزر گئے اور وہی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ولادت تو اسکے بہت بعد ہے اگر اس وقت خاص کا نقشہ ہماری آنکھوں میں کھنچ جائے تو کونسی تعجب کی بات ہے اور جسطرح ہم وقت معین پر لبیک کہکر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اسیطرح وقت معین پر فداک ابی وامی یا رسول اللہ کہکر کھڑے ہوجائیں تو کونسی بُری بات ہوگی۔ اب رہی یہ بات کہ مولود شریف قرون ثلثہ میں نہیں تھا تو یہ بھی قطعاً تسلیم نہیں اس لئے کہ جتنی روایتیں مولود شریف میں پڑھے جاتے ہیں وہ موضوع نہیں بلکہ کتب احادیث میں سب موجود اور صحابہ سے منقول ہیں۔ جس سے ثابت ہے کہ جتنی روایتیں مولود کی کتابوں میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب صحابہ کے زمانہ میں پڑھے جاتے تھیں البتہ نئی بات یہ ہے کہ میلاد شریف سے متعلق حدیثیں ایک جگہ جمع کردی گئیں مگر یہ بھی قابل اعتراض نہیں اسلئے کہ محدثین نے بھی آخر ہر قسم کی حدیثوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے جو صحابہ نے نہیں کیا تھا۔ پھر صحابہ وغیرہم کا دستور تھا کہ جب کوئی واقعہ پیش نظر ہوتا تو اس سے متعلق جتنی حدیثیں یاد ہوتیں پڑھ دیتے اسیطرح میلاد مبارک کا واقعہ پیش نظر ہونے سے وہ سب روایتیں پڑھی

جاتی ہیں اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولود شریف کا پڑھنا صحابہ کی سنت ہے۔ اب اگر محلِ اعتراض ہے تو یہی ہے کہ میلاد شریف کی محفل قرونِ ثلثہ میں اس ہیئت پر نہ تھی سو اسکا جواب یہ ہے کہ اس محفل مبارک سے ایک بڑی مصلحت متعلق ہے وہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے اقوام اپنے نبیوں کی پیدائش کے روز خوشیاں منا کر اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں دور اندیش علماء نے یہ خیال کیا کہ بعد زمانہ نبوی سے مسلمانوں کی طبیعتوں میں بے باکی پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ نماز روزہ میں بھی لوگ قصور کرنے لگے جس سے دوسرے اقوام میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اب مسلمانی برائے نام رہ گئی ہے اور وہ رعب و داب جو جانباز مسلمانوں کا اُنکے دل میں تھا کہ یہ لوگ اپنے نبی کے حکم پر جان دینے کو مستعد ہیں جانے لگا۔ اگر یہی خیال اُنکا ترقی پذیر ہوا اور مسلمانوں میں کوئی جوش اسلامی باقی نہ رہے تو چند روز میں بالکل بے وقعتی کی نگاہوں سے وہ دیکھے جائینگے اور معرض تلف میں ہو جائینگے اسلیئے یہ تدبیر نکالی کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جوش اُنکے دلوں میں پیدا کر دیا جائے چنانچہ مجالس وعظ میں عموماً ایسے مضامین بیان کرنے لگے جو باعث ازدیاد محبت ہوں مثلاً شفاعت کا مسئلہ اور صحابہ اور اولیاء اللہ کے فضائل اور حکایات اور معجزات اور فضائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بیان کرنے لگے جنکے سننے سے اپنے نبی کی عظمت ذہن نشین اور باعث ترقی محبت ہو پھر محفل میلاد کی بنیاد ڈالی جس سے موافقین اور مخالفین کا امتیاز ہو جائے کیونکہ مخالفین کو حضرتؐ کی پیدائش کی خوشی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اسکا سخت صدمہ اُنکے دلوں پر ہوتا ہے جس طرح خاص میلاد کے روز شیطان پر ہوا تھا غرضکہ اسکا اثر یہ ہوا کہ ہر فقیر و امیر بقدر حیثیت اس محفل مبارک میں روپیہ صرف کر کے اسکا

عملی ثبوت دیتا ہے کہ ہم اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے دعا گو اور آپ کے وجود باجود سے خوش ہونیوالوں میں ہیں جس سے مخالفین پر یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس گری ہوئی حالت میں بھی اپنے نبیؐ کے شیفتہ اور دلدادہ ہیں نبض شناسان زمانہ خوب جانتے ہیں کہ یہ جوشِ محبت اسلامی کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہی جوش مخالفوں سے انکو ممتاز اور علیحدہ کرنے والا ہے۔ اگر یہ جوشِ محبت بھی جاتا رہے تو اکثر مسلمانوں کی حالت گواہی دے گی کہ انکو نہ احکام دینیہ سے تعلق ہے نہ اپنے نبیؐ سے محبت اور ظاہر ہے کہ اس بے تعلقی کا کیسا بُرا اثر مسلمانوں پر پڑے گا غرض قطع نظر فضیلت اور استحباب کے مولود شریف میں ایک ایسی مصلحت ملحوظ رکھی گئی جو دین و دنیا میں محمود و مطلوب ہے۔

دین میں اسوجہ سے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب تک آدمی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے ماں باپ اور اولاد اور مال سے بلکہ اپنی جان کی محبت سے زیادہ نہو اسکا ایمان قابل شمار نہیں اور دنیاوی مصلحت وہ جو مذکور ہوئی جسکو اسرار شناسان اسلام جانتے ہیں کہ موجد نے اسکو کیوں ایجاد کیا کیا مصلحت وقت کا لحاظ رکھنے کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دی ہے کیوں نہیں صدہا احادیث اسپر شاہد ہیں اسکو دیکھ لیجئے کہ قبل ہجرت کس قسم کے احکام اور حالات تھے اور بعد ہجرت قوت اسلام کے زمانہ میں کس درجہ پر پہونچے۔ اہلِ حدیث یہ بھی جانتے ہیں کہ آخری زمانہ کے مسلمانوں کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کی سہولتیں فرمائی ہیں۔ یہاں تک تو فرما دیا کہ دسویں حصہ پر بھی اگر وہ لوگ عمل کرلیں تو صحابہ کے برابر انکو ثواب ہوگا۔ اب انصاف کیا جائے کہ مصالح دینیہ و دنیویہ پر

لحاظ رکھکر محفل میلاد شریف کیجاے تو کیا وہ باعث دخول دوزخ ہوگی۔
اور وہ ارشاد نبوی کہ اعمال کے حسن و قبح کا دار و مدار نیت پر ہے اور خدائے تعالی
عمل کو نہیں دیکھتا ہے۔ نیتوں کو دیکھتا ہے وغیرہ۔ احادیث معاذ اللہ بیکار ہو جائیگی
ہرگز نہیں۔ غرضکہ اس قابل تحسین نیت کے بعد ہمارا حسن ظن تو یہ ہے کہ یہ عمل باعث
خوشنودی خدا اور رسول ہے۔ اور یقین ہے کہ بمصداق انا عند ظن عبدی بی۔ یہ ہمارا حسن
ظن بیکار نہ جائے گا۔ ہم اسکو مانتے ہیں کہ بعضے علما نے صرف حدیث کل بدعۃ ضلالۃ
کو پیش نظر رکھکر اس مجلس متبرکہ میں کلام کیا ہے مگر آپنے دیکھ لیا کہ جو نکتہ رس۔ وقیقہ شناس
علما رتھے۔ مثل حافظ۔ شیخ الاسلام۔ ابن حجر عسقلانی اور امام سیوطی وغیرہ۔ رحمہم اللہ انہوں
نے اسکا جواز استحباب ثابت کر دیا۔ غور کیجئے۔ کہ وہ بھی آخر مقتدا اور متبحر علما مانے
جاتے ہیں۔ جن کے اقوال استدلال میں پیش کئے جاتے ہیں انکو گمراہ و مخالف اسلام
قرار دینا کیونکر جائز ہو گا۔ ایسے موقع میں تو انکا احسان ماننا چاہئے کہ انہوں نے علاوہ
اور مصالح کے شرعی طور پر بھی اسکا استحباب ثابت کر دیا۔

یہاں شاید ناواقفوں کو یہ خلجان ہو گا کہ ایک ہی چیز حرام اور مستحب کیونکر ہو سکتی
ہے۔ پھر کیا وجہ کہ مولود شریف کو ایک جماعت حرام اور ایک جماعت مستحب
کہتی ہے۔

اس خلجان کو اسطرح دفع کیا جائے کہ جن علما رکی نظر محدود رہی کہ مولود شریف قرون
ثلثہ میں نتھا وہ اسکی حرمت کے قائل ہو گئے اور جن کی نظر وسیع تھی وہ مصالح اور اغراض
پر غور کر کے استحباب کے قائل ہو گئے۔
دیکھئے۔ صرف و نحو کا علم نہ حضرت کے زمانہ میں تھا نہ صحابہ کے زمانہ میں گو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چند قاعدے بیان فرما کر اسکی بنیاد ڈالی مگر تدوین
اسکی ایک مدت میں ہوئی اور نہ قال کی اصل قول ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم ہو سکتی
ہے۔ مگر چونکہ قرآن و حدیث کا سمجھنا سمجھانا ان علوم سے متعلق ہے اسلئے گو وہ بدعت
ہیں مگر انکی تعلیم واجب قرار دیگئی اگر ہمارے دین سے ان علوم کو تعلق نہوتا تو ان کی
حرمت پر ضرور فتویٰ دیا جاتا اس سے ظاہر ہے کہ اغراض صحیحہ کے لحاظ سے کبھی
وجوب بھی آجاتا ہے جسکو وجوب لغیرہ کہتے ہیں۔ پھر اگر مولود شریف میں باوجود بدعت
ہونے کے استحباب آجائے تو کیا عجب غرضکہ علما جانتے ہیں کہ اغراض مصالح اور جہات
کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

جو ضرورت اس محفل مبارک کی ایجاد اور القا میں علمائے متاخرین کے پیش نظر
تھی اسکا وجود قرون ثلثہ میں نہ تھا اسلئے اُس زمانہ کے کل اہل اسلام وقتاً فوقتاً ہر ایک
امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا عملی ثبوت دیتے تھے جسکا اثر یہ ہوا کہ اسلام
شرقاً و غرباً انکی جانبازیوں سے پھیلا اُن کو ضرورت نہ تھی کہ سال میں ایک بار
اپنی محبت کا اظہار کریں۔ بخلاف اس زمانہ کے کہ کل اہل اسلام سال میں ایک بار
بھی اگر اپنی سچی محبت اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد مبارک میں ظاہر کریں
تو غنیمت ہے۔

قرون ثلثہ میں روز میلاد مبارک کے عید مقرر نہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو علامہ
نجم الدین غیطی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التعریف بالمولد الشریف میں مولفہ علامہ شمس الدین ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ
سے نقل کیا ہے کہ جو روز میلاد شریف کا ہے وہی وفات شریف کا دن ہے۔
اسلئے سرور و غم برابر برابر ہو گئے انتہی۔ اگر غور کیا جائے تو اُن شیفتگان جمال نبوی پر

وہ روز ایسی مصیبت اور ماتم کا تھا کہ جسکا بیان نہیں ہو سکتا جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں صحابہ کی یہ حالت تھی کہ ہر مجلس ماتم کدہ بنی جاتی چنانچہ بخاری شریف میں ؏ہے کہ اُس زمانہ میں اتفاقاً صدیق اکبر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا گزر انصار کی مجلس پر ہوا دیکھا کہ سب زار زار رو رہے ہیں اُسکا سبب دریافت کیا اہل مجلس نے کہا کہ ہمیں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسیں یاد آتی ہیں جن میں حضرت کے ساتھ ہم لوگ بیٹھتے تھے اب قرائن سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ دن آگئے کہ ہم لوگ اس دولت عظمیٰ اور فیضان مصاحبت سے محروم ہو جائیں۔ اُن شیفتگان دیدار نبوی کی حالت کا اندازہ اِس روایت سے ہو سکتا ہے جو بخاری شریف میں ہے کہ ایک روز صبح کی نماز ہو رہی تھی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ مبارک کا پردہ اس غرض سے اُٹھایا کہ نماز کی حالت ملاحظہ فرماویں پردہ اٹھنا ہی تھا کہ صدیق اکبرؓ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور مارے خوشی کے قریب تھا کہ نماز کو توڑ کر دیدار جاں بخش سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں مگر حضرتؐ کب گوارا کر سکتے تھے کہ عبادت الٰہی میں خلل واقع ہو فوراً یہ فرما کر پردہ چھوڑ دیا کہ نماز کو تمام کر لو۔" دیکھئے صحابہ حضور قلب وغیرہ لوازم و اداب نماز کو خوب جانتے تھے مگر غلبۂ شوق دیدار نے سب بھلا دیا اور ایک ایسی حالت طاری ہوئی جو مصداق اِس شعر کے تھی ؎

در نماز م خم ابروے تو چوں یاد آمد — حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

روز وفات ہر چند صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نہایت استقلال اور تکلف سے

؏ اس مقام کی کل روایتیں المواہب اللدنیہ میں موجود ہیں۔ ۱۲

کام لیکر خطبہ پڑھا اور مسلمانوں کو تسلی دی مگر حالت یہ تھی کہ وہ بھی ضبط گریہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور بے اختیار کہتے تھے کہ یا رسول اللہ آپ کی وفات سے وہ چیز منقطع ہو گئی جو کسی نبی کی موت سے منقطع نہیں ہوئی تھی آپ کی نعت جسقدر کی جائے تھوڑی ہے اگر ہمارا بس چلتا تو ہم سب آپ پر سے اپنے کو فدا کر دیتے اور ایک مرثیہ پڑھا جسکا ایک شعر یہ ہے۔

یا لیتنی من قبل مهلك صاحبي — غيبت في جدث على صخورا

یعنی کاش میں اپنے صاحب کی وفات سے پہلے اپنی قبر میں مدفون ہوتا اور مجھ پر پتھر ڈالے جاتے۔"

عمرؓ کو تو اُس صدمہ جانکاہ نے دیوانہ ہی بنا دیا تھا کچھ ایسے حرکات اُسوقت اُن سے صادر ہو رہے تھے کہ سب حضار ترساں و لرزاں تھے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن سے کچھ کہہ سکے جب کسیقدر افاقہ ہوا تو کہنے لگے یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ جس ستون کے پاس خطبہ پڑھا کرتے تھے جب منبر بنایا گیا اور آپ اُس پر خطبہ پڑھنے لگے تو ستون پر آپکے فراق کا اسقدر صدمہ ہوا کہ آدمی کی طرح زار زار روتا تھا تو پھر امت کا کیا حال ہونا چاہیئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اُسوقت یہ حالت تھی کہ مُنہ سے بات نہیں نکل سکتی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر اِس قسم کا اتنا بار پڑا کہ باوجود اُس قوت و شجاعت کے آپ زمین پر بیٹھ گئے اور حس و حرکت دشوار ہو گئی۔

حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السّلام پر اِس صدمہ کا اثر اسقدر ممتد ہوا کہ جب تک آپ زندہ رہیں گویا جانتے ہی نہیں کہ ہنسی کیا ہے۔

بلال رضی اللہ عنہ جب اذان میں اشہد ان محمداً رسول اللہ کہتے تو مسجد میں کہرام مچ جاتا تھا۔

عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہی اس صدمۂ جاں ستاں سے ہو گیا

غرضکہ اس حادثۂ جانکاہ سے کل صحابہ کی یہ حالت تھی کہ اُن پر زندگی وبال جان ہو گئی تھی اب غور کیجیے کہ جب دوازدہم شریف کا روز اُن شیفتگان جمال نبویؐ اور سوختگان آتش فراق پر آتا ہو گا تو اُنکی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ کیا ایسی حالت میں کسی قسم کی خوشی دل میں راہ پا سکتی ہے ہرگز نہیں۔ ایک مدت تک مسلمانوں کی تقریباً اسی قسم کی حالت رہی۔ متاخرین نے دیکھا کہ اب مسلمانوں کے دلوں پر عموماً وہ جوش محبت تو رہا ہی نہیں جو مقتضی غم وفات ہو اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معنے تو صرف اسیقدر رہیں کہ اس عالم سے دوسرے عالم کو تشریف لے گئے ورنہ حضرت کی زندگی میں کیا شک اسلئے اُس غم کو جو عارضی تھا کالعدم کر کے اصلی مسرت اور خوشی کو جسکا اثر قیامت تک باقی ہے پیش نظر رکھا اور اُس روز کو خالص روز عید قرار دیا جس میں کل اہل اسلام بالاتفاق اپنی محبت اور گرمجوشیاں ظاہر کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیں۔ چنانچہ اس قرارداد علما کو تقریباً کل اہل اسلام نے مان بھی لیا اور صورت اجماعی منعقد ہو گئی۔ اور بمصداق ما رآہ المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن وہ قابل تحسین ہی ہوئے۔ پھر اُن حضرات نے اِس سے بڑے بڑے فوائد بھی حاصل کئے چنانچہ نجم الدین غیطی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے امام شمس الدین الجزری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا کہ مولود شریف کی خاصیت یہ ہے کہ جس سال وہ محفل کی جاتی ہے

اُس سال بلاؤں سے امن رہتا ہے اور یہ فقط اعتقادی بات ہی نہیں بلکہ اُس کا تجربہ بھی مکرر ہو چکا ہے۔ الحاصل محفل میلاد میں کئی مصلحتیں اُن حضرات کے پیش نظر تھیں اور مصالح کا لحاظ کرنا شرعاً محمود اور مسنون ہے۔ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک منافق مرا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی گئی کہ اپنا ملبوس خاص عنایت فرماویں تاکہ برکت کے لیے اُسکے کفن میں وہ شامل کیا جائے حضرتؐ نے اپنا قمیص مبارک بدن سے اُتار کر عنایت فرمایا اور صحابہ کو اس مصلحت پر مطلع فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ میرے قمیص سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا اسلئے کہ وہ منافق ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس رعایت خاص کی وجہ سے اُسکی قوم سے ہزار شخص مسلمان ہو نگے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دیکھئے حضرتؐ کا پیرہن مبارک جو اعلیٰ درجہ کا تبرک ہے منافق جو کافر سے بھی بدتر ہے اُسکے کفن کے لئے دینا ہرگز کسی مسلمان کی طبیعت گوارا نہیں کر سکتی مگر حضرتؐ نے عمومی مصلحت کے لحاظ سے اُسکو گوارا فرمایا۔

چنانچہ بخاری شریف اور فتح الباری میں ہے کہ عمرؓ ایک روز خانۂ کعبہ میں جا بیٹھے اور کہا کہ میرا قصد یہ ہے کہ جسقدر سونا چاندی کعبہ شریف میں رکھا ہے سب مسلمانوں میں تقسیم کر دوں ابو وائل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آپ نہیں کر سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کو باوجودیکہ آپ سے زیادہ مال کی احتیاج تھی مگر انہوں نے یہ خیال نہیں کیا عمرؓ نے کہا کہ بیشک ان حضرات کی اقتدا مجھے بھی ضرور ہے۔

شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ کعبہ شریف کا خزانہ خرچ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تعظیم الاسلام اور ترہیب اعداء اُس سے متعلق ہے اسلئے کہ خزانہ کعبہ شریف اُس

زمانہ میں مشہور تھا اس سے مستفاد ہے کہ شوکت اسلام کے لئے اگر کوئی ایسا کام کیا جائے جو ضرورت سے زیادہ ہو اسکی اجازت ہے چنانچہ شیخ الاسلام رحمہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ سونا چاندی کی قندیلیں کعبہ شریف اور مسجد نبوی میں لٹکانے کو تقی الدین سبکی رحمہ نے جائز لکھا ہے دیکھئے اس میں بھی صرف شوکت اسلام ملحوظ ہے ورنہ ضرورت تو معمولی چراغوں سے بھی رفع ہو سکتی تھی۔ اسیطرح فتح الباری میں یہ بھی لکھا ہے کہ کعبہ شریف کو جو دیباج کی کسوت پہنائی جاتی ہے اسکے جواز پر اجماع ہو گیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی زین الدین عبد الباسط نے بحسب حکم شاہی ایک ایسی بہتر کسوت خانہ کعبہ کے لئے تیار کی کہ اسکی عمدگی بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور لوگ انکی تحسین اس فعل کی کر کرتے دعائیں دیں کہ بسط اللہ تعالیٰ فی رزقہ وعمرہ وجزاہ اللہ عن ذالک احسن المجازاۃ دیکھئے اس میں بھی وہی شوکت اسلام ملحوظ ہے ورنہ اول تو گھر کو کسوت پہنانا کوئی ضروری بات نہیں اور اگر کسی قسم کی ضرورت ہے بھی تو بیش قیمت دیباج کی ضرورت نہیں جسکے جواز پر اجماع ہو گیا ہے۔ اور کسوت خانہ کعبہ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھی۔ خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ میں لکھا ہے کہ عثمان رض نے مسجد نبوی کی تعمیر از سر تو نہایت تکلف سے کی چنانچہ دیواروں کے پتھروں میں نقش و نگار کیا گیا اور ستون کے پتھر بھی نقشی پرکار تھے سقف ساج کا بنوایا گیا جو اس زمانے کی بیش قیمت لکڑی تھی اور ممبر شریف پر غلاف پہلے آپ ہی نے اوڑھایا۔ دیکھئے یہ سب امور شوکت اسلام سے متعلق ہیں ورنہ یہی مسجد مقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اسوقت تک نہایت سادی اور تکلف سے عاری تھی۔ نہ نقش و نگار تھا نہ ممبر پر غلاف اوڑھایا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ باوجودیکہ خانہ کعبہ اور

ممبر شریف کا غلاف ہمیشہ صحابہ کے پیش نظر رہا کرتا تھا مگر کسی سے یہ اعتراض مروی نہیں کہ بے ضرورت کپڑا کیوں اوڑھایا جاتا ہے کیا ان لکڑیوں اور گھر کو سردی ہوتی ہے جیسے ہمارے زمانہ کے بعض حضرات غلافوں کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔

اب یہ دیکھا جائے کہ مولود شریف میں کیا کام ہوتے ہیں اور وہ شرعاً جائز ہیں یا نہیں بڑے کام یہ ہیں اظہار سرور تعین وقت۔ قصائد نعتیہ کا پڑھنا۔ تقسیم شیرنی اور بخور کا جلانا وغیرہ اظہار سرور کا حال سنئے کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ان اللہ لا یحب الفرحین یعنے فرحت والوں کو حق تعالیٰ دوست نہیں رکھتا مگر فضل اور رحمت الٰہی پر فرحت کرنے کا حکم ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا یعنے لوگوں سے کہدو کہ صرف اللہ کے فضل اور رحمت کی خوشی کیا کریں۔

مطلب ان آیتوں کا یہ ہوا کہ اگر کوئی خوشی کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کی خوشی کرے۔ اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم میمنت لزوم سے اس عالم کو عزت بخشنا کیا بڑا فضل اور رحمت الٰہی ہے۔ اس سے بڑھکر کیا ہو کہ آپ ہمہ تن فضل اور رحمت ہیں چنانچہ النبحۃ السویہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام فضل اللہ بھی ہے جس پر ابن وجیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ حق تعالےٰ فرماتا ہے ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلاً یعنے اگر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت تم پر نہوتی تو تم شیطان کی پیروی کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فضل اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں انتہیٰ اور اسی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت کے اسماء یہ بھی ہیں۔ رحمہ۔ رحمۃ الامہ۔ نبی الرحمہ۔ رحمۃ للعالمین۔ رحمۃ مہداۃ اور آیہ

شریفہ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کو ذکر کر کے ابن عباس رضی اللہ عنہ
کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نہ صرف مسلمانوں کے حق میں رحمت تھے بلکہ کفار کے
حق میں بھی رحمت تھے اور یہ حدیث طبرانی اور حاکم سے نقل کی ہے قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم انا رحمۃ مھداۃ یعنے میں اللہ کی رحمت ہوں جو تمہارے
لئے ہدیہ بھیجی گئی ہے۔ اب کہئے کہ ایسے ہمہ تن فضل اور رحمت کے نزول کے روز
کو ہم عید نہ قرار دیں تو ہم سے زیادہ ناقدر شناس کون ہو کہ خدائے تعالیٰ کے ہدیہ
کی بھی ہمنے کچھ قدر نہ کی حالانکہ فضل اور رحمت الٰہی پر خوشی کرنا ہمارا فرض ہے جو آیہ
موصوفہ فبذلک فلیفرحوا سے ظاہر ہے تعیین وقت اسکا حال ابھی معلوم ہوا
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم عاشورہ خود بھی رکھا اور اسکے فضائل بیان
فرمائے اور اس روایت سے بھی ظاہر ہے جو بخاری شریف کی کتاب الایمان میں
ہے کہ کسی یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپکی کتاب یعنے قرآن شریف
میں ایک آیت ہے کہ اگر وہ ہماری کتاب میں ہوتی تو ہم لوگ اسکے نزول کے دن کو
عید بناتے آپنے فرمایا کونسی آیت ہے کہا الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم
نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا جسکا ترجمہ یہ ہے کہ آج کے روز میں نے
تمہارے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کیا اور تمہارے دین اسلام سے
راضی ہوا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آیت کس مقام پر اور کس
روز نازل ہوئی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرفات پر کھڑے تھے یعنے حج کے روز اور جمعہ کا دن
تھا انتہی۔ شرح بخاری شریف میں شیخ الاسلام عسقلانی رح نے لکھا ہے کہ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے
کہ یہودی کا سوال تھا تو یہ تھا کہ اس آیۃ کی جلالت شان مقتضی ہے کہ اسکے نزول

کا روز عید بنایا جاتا اور جواب میں مقام اور وقت نزول بیان کیا گیا جسکو سوال سے
کوئی تعلق نہیں حالانکہ جواب میں سوال کی مطابقت چاہئے۔ اسکا جواب یہ ہے
کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اشارۃً جواب دیا کہ وہ دونوں روز ہمارے یہاں روز عید ہیں
اور ترمذی اور طبرانی وغیرہ کی روایتوں میں یہ بتصریح موجود ہے کہ بحمد اللہ ہمارے
یہاں وہ دونوں روز عید ہیں حاصل یہ کہ یہودی کا مقصود تھا کہ اس نعمت عظمیٰ
کا دن اس قابل تھا کہ عید قرار دیا جاتا جس میں ہمیشہ خوشی ہوا کرتی ہے اس لئے
کہ عید عود سے ماخوذ ہے جسکے معنے مکرر ہونے کے ہیں چونکہ روز عید مکرر ہوا کرتا
ہے اس لئے اسکا نام عید رکھا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو تسلیم کر لیا چنانچہ
اسکے جواب میں کہا کہ ہمارے یہاں اس نعمت کی دوہری عید منجانب اللہ مقرر ہے
ورنہ صاف کہدیتے کہ یہ تم لوگوں کی حماقت ہے کہ ایک گزشتہ واقعہ پر ہر سال خوشیاں
منایا کرتے ہو۔ اب غور کیجئے کہ جب یہ مسلم ہے کہ کسی نعمت عظمیٰ کے حصول کا دن
اس قابل ہے کہ ہمیشہ اس میں خوشی اور عید کی جائے تو بتائیے کہ مسلمانوں کے
نزدیک حضرت کی تشریف آوری اور نزول اجلال سے بڑھکر کونسی نعمت ہو سکتی ہے پھر اگر
اس روز خوشی نہ کی جائے تو کونسا دن آئیگا جس میں ایمانی طریقہ سے خوشی کی جائے
گی۔ اگر اس آیۂ شریفہ کے نزول کے روز دوہری عید ہے۔ تو نزول اجلال
سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے روز یعنے میلاد مبارک کے روز اس سے دہ چند زیادہ
خوشی اور عید ہونی چاہئے۔

قصائد نعتیہ کا پڑھنا اہل حدیث جانتے ہیں کہ قصیدہ بانت سعاد جو نعت میں
ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پڑھا گیا اور حضرت نے اسکے صلہ میں چادر مبارک

عطا فرمائی اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے ممبر رکھا جاتا تھا جس پر وہ اشعار نعتیہ پڑھتے تھے جس کا حال ہمنے انوار احمدی میں کسیقدر بسط سے لکھا ہے۔

تقسیم شیرنی - وہ اطعام طعام میں داخل ہے جسکی تعریف قرآن شریف میں مصرح ہے۔ کما قال تعالیٰ ویطعمون الطعام علیٰ حبہٖ
اس کے سوا بہت سی آیات واحادیث اُس کی فضیلت میں وارد ہیں جو محتاج بیان نہیں۔

بخور جلانا - خلاصۃ الوفا میں ابن ماجہ کی روایت مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجدوں کو جمعہ کے روز بخور دیا کرو اور لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بخوردان آیا اُس کو آپ نے سعدؓ کے حوالہ کیا کہ اُس میں بخور جلا کر ہر جمعہ اور رمضان میں مسجد نبوی کو بخور دیا کریں۔ اور ایک شخص اسی کام پر مامور تھا کہ جمعہ کے دن بخور جلا کر ہر شخص کے پاس لیجاویں اور سب کو معطر کریں۔ غرضکہ اماکن اور اوقات متبرکہ میں بخور کی خوشبو سے اہل جلسہ کو معطر کرنا مسنون ہے۔

قیام - اِس کا حال اوپر لکھا جاچکا ہے لیکن تکملۃً یہاں بھی لکھا جائے تو بے موقع نہوگا۔ احادیث مذکورہ بالا سے ثابت ہے کہ تخیل پر اصل واقعہ کے آثار مرتب ہونا قطع نظر اس کے کہ امر طبعی ہے۔ شریعت میں بھی اسکے نظائر موجود ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب آیہ شریفہ وابیضت عیناہ پڑہی تو وہ تے روتے بیخود ہوگئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے مقام تبوک میں اظہار خوف وخشیت کیا۔ اور ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خوشی کا دن ہمیشہ کے لئے روز عید مقرر ہوا۔ اور موسیٰ علیہ السّلام کی نجات کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شکریہ کا روزہ رکھا اور ترغیب امت کے لئے اُس کے فضائل بیان فرمائے۔ اور اپنی ولادت باسعادت کے روز یعنے روز دوشنبہ حضرتؐ ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور ابولہب کو دوزخ میں پانی پینے کو ملا کرتا ہے خاص خاص واقعات کے آثار اُن کی خاص قسم کی تخیل پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ اس صورت میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کی تخیل پر مسلمانوں کے دل میں فرحت پیدا ہو تو نہ شرعاً وہ مذموم ہے نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جو اصلی واقعہ کے آثار مرتب ہوتے ہیں تخیل پر مرتب کرنا درست نہیں۔ اس بنا پر جتنی حدیثیں اس باب میں وارد ہیں کہ فرحت کے وقت کھڑے ہوجانا درست بلکہ مسنون ہے سب ہمارے مفید مدعا ہوگئیں کیونکہ جب مسلمان میلاد شریف کے حالات سنتے ہیں تو اُن کو بیحد خوشی ہوتی ہے اس وجہ سے کہ حضرتؐ کا اس عالم میں تشریف فرما ہونا اُنکے لئے نجات اور فرحت ابدی کا باعث ہوا۔ کیا کوئی مسلمان ایمان کی راہ سے یہ کہ سکتا ہے کہ نجات ومسرت ابدی سے زیادہ کوئی نعمت ہرگز نہیں۔ پھر جب کم درجہ کی فرحتوں میں قیام جائز اور مسنون ہو تو اس اعلیٰ درجہ کی فرحت میں قیام کی کس قدر ضرورت ہوگی۔ اب اُن روایتوں کو سنئے جن سے فرحت کے وقت قیام کا مسنون ہونا ثابت ہے۔

فتح الباری میں شیخ الاسلامؒ نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے روز عکرمہ ین کی طرف

بھاگ گئے تھے اُنکی بی بی نے اُنہیں مسلمان کرکے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا تو حضرت اُنکو دیکھتے ہی کمال خوشی سے کھڑے ہوگئے اسی قسم کی اور روایتیں بھی ذکر کیں جنمیں حضرت جعفرؓ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے قدوم کے وقت اور حضرت فاطمہؓ رضی اللہ عنہا کو دیکھکر قیام کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکور ہے۔

بخاری شریف میں یہ روایت ہے ابصر النبی صلے اللہ علیہ وسلم نساءً وصبیانا مقبلین من عرس فقام ممتنا فقال اللھم انتم من احب الناس الیّ یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند عورتوں اور لڑکوں کو دیکھا کہ کسی کے نکاح سے چلے آرہے ہیں فوراً کھڑے ہوگئے اور فرمایا خدا جانتا ہے تم لوگ سب سے زیادہ میرے محبوب ہو۔ شیخ الاسلام نے قام ممتنا کی شرح میں لکھا ہے کہ قام الیھم مسرعا مشتدا فی ذلک فرحا بھم یعنے کمال فرحت کی وجہ سے نہایت جلدی سے کھڑے ہوگئے اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ قیام معانقہ وغیرہ کے لئے نہیں تھا۔ اسلئے کہ عورتوں اور لڑکوں سے معانقہ درست نہیں بلکہ مقصود اُس سے صرف اظہار فرحت تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ قدوم احباب کے وقت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرمایا کرتے تھے اسکی وجہ بھی اظہار فرحت ہی ہوا کرتی تھی تو اب مسلمانوں کو چاہئے کہ جس وقت میلاد شریف میں اور اُس میں سردار کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا اس عالم میں تشریف فرمانا پیش نظر ہوجائے جو اعلیٰ درجہ کی فرحت کا باعث ہے تو اُسوقت ان احادیث کو اپنا پیشوا اور مقتدا بناکر خوشی سے کھڑے ہوجایا کریں اور بدعت اور تشبہ فی العبادت وغیرہ شبہات کو

ان روایات سے دفع کردیا کریں۔ یہی امور گویا محفل میلاد کے ذاتیات ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ وہ فرادیٰ مسنون یا مستحب تو ضرور ہیں۔ رہے امور خارجیہ جیسے عورتوں کا مولود شریف ایسے طور پر پڑھنا کہ اجنبی لوگ اُنکی آوازیں سنیں یا نشہ کی حالت میں پڑھنا۔ یا اور کسی قسم کی بے ادبی پڑھنے کے وقت کرنی جو شرعاً ممنوع ہو وہ ضرور اس قابل ہیں کہ موقوف کردئے جائیں جیسے کل عبادات میں یہی حکم ہے۔ مثلاً نماز لوگوں کے تبلانے کی غرض سے پڑھنی جس سے احتراز کی ضرورت ہے مگر ایسے امور سے نماز یا مولود شریف کے جواز میں کلام نہیں ہوسکتا۔ رہی ہیئات اجتماعی امور مذکورہ کی سو اُسکا بھی جواز بلکہ استحباب بتصریح علما ثابت ہوگیا اور قطع نظر اُسکے اس قسم کے بدعتوں کی ایجاد کی شرعاً اجازت ہے۔

جیسا کہ حدیث صحیح من سن سنۃ حسنۃ الحدیث سے ظاہر ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی اچھا کام ایجاد کرے اُسکو ثواب اُسکا اور اُسپر عمل کرنے والوں کا ملے گا۔ اور جو بُرا کام ایجاد کرے اُسکا اور اُسپر عمل کرنے والونکا گناہ اُسپر ہوگا۔

دیکھئے قرون ثلثہ کی یا اور کسی بات کی تخصیص نہیں بلکہ عام ارشاد ہے کہ جو کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے اگر اسکی تخصیص قرون ثلثہ کی ساتھ کردی جائے تو بدعتیوں کو بڑی بڑی دلیل جائیگی وہ یہ کہیں گے کہ جس طرح اچھے کاموں کی وہی ایجاد باعث ثواب ہے جو قرون ثلثہ میں ہو اسیطرح بُرے کاموں کی بھی وہی ایجاد باعث عذاب ہوگی۔ جو قرون ثلثہ میں ہو اسلئے بدلیل مقابلہ دونوں شقوں میں تعمیم یا تخصیص ایک ہی قسم کی معتبر ہوگی اور اُس صورت میں مطلب حدیث شریف یہ ہوگا کہ جتنے بُرے کام قرون ثلثہ کے بعد ایجاد کئے جائیں وہ قابل مواخذہ نہیں حالانکہ یہ غلط ہے اس سے ثابت ہے کہ بُرے کاموں کی ایجاد جسطرح ہر زمانہ میں مذموم ہے اچھے کاموں کی ایجاد بھی ہر زمانہ میں محمود ہے۔ الحاصل اگر

مولود شریف بدعت بھی ہو تو بدعت حسنہ ہے جسکی اجازت شریعت میں وارد ہے۔ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ تاج فاکہانی نے مولود شریف کو بدعت مذمومہ لکھا ہے مگر امام سیوطی رحمۃ اللہ نے انکے استدلال اور تقریر کو حرفاً حرفاً رد کیا۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بعض معاصرین اس رسالہ کی چند حدیثوں کو درایت کے شکنجہ میں ضرور کھینچیں گے مگر چونکہ اس میں ہمارے ہم مشربوں کی طرف ہمارا روئے سخن ہے اسلئے انکے شبہات کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اسپر بھی اگر شوق ہو تو ہم نے کتاب العقل اور حقیقۃ الفقہ اور افادۃ الافہام وغیرہ میں بحث درایت تفصیل سے لکھی ہے اُن میں ملاحظہ فرمائیں امید ہے کہ اہل انصاف کو اُس سے تسکین ہو جائیگی۔

تحقیق الایمان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن

اما بعد اضعف العباد محمد انوار اللہ عفی عنہ اہل اسلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مسئلہ ایمان ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے جسکے معلوم کرنے کی ضرورت ہر ایماندار کو ہے بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ رسمی ایمان کو حقیقی ایمان سمجھ لیتے ہیں چنانچہ چند بدوؤں نے دعوے کیا تھا کہ ہم ایمان لائے۔ مگر خود اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اُن سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے اور ہنوز دل میں تمہارے ایمان نہیں داخل ہوا یہ کہو کہ ہم منقاد و فرمانبردار ہو گئے ہیں جیسا کہ اس آیہ شریف میں ہے۔ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم اور دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ یاایہا الذین آمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل ومن یکفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر فقد ضل ضلالا بعیدا۔ اے مسلمانوں اللہ پر ایمان لاؤ اور اُسکے رسول پر اور اوس کتاب پر

جو اُس نے اپنے رسول پر اُتاری ہے اور اُن کتابوں پر جو پہلے اُتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہو اور اُسکے فرشتوں کا اور اُسکی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور روز آخرت کا تو بڑی دور بھٹک گیا۔ کوئی بات تو ہوگی جو حق تعالیٰ اہل ایمان کو مخاطب کرکے ایمان لانے کا حکم فرماتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ جو خود ایمان دار ہوں اُنکا ایمان لانا تحصیل حاصل ہے جو محال ہے۔ اس بات پر ہر شخص کا وجدان گواہی دیگا کہ آدمی جب کوئی خبر سنتا ہے تو اُس کے دل میں ایک قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو اُس خبر کے صدق سے متعلق ہے۔ ہر چند مدارج اُس کے بے انتہا ہو سکتے ہیں۔ مگر علماء نے اُس کے چار درجے قرار دیئے ہیں وہم، شک، ظن اور یقین۔ پہلا درجہ وہم ہے جسمیں اُس خبر کے صدق کا احتمال مرجوح اور عدم صدق کا احتمال راجح ہو۔ مثلاً اخباروں میں جب یہ خبر شایع ہوئی کہ سوا ے تار برقی کے ایک آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے کہ اُسکے ذریعہ سے بغیر تعلق تار وغیرہ کے دور دور کی خبریں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس لحاظ سے کہ آج کل اقسام کی ایجادیں ہو رہی ہیں اِس خبر کے صدق کا احتمال تو ہو گیا مگر اس لحاظ سے (کہ بغیر تعلق کے دور دور کی خبریں معلوم ہونا خلاف عقل ہے) ظن غالب اور احتمال راجح یہی تھا کہ جھوٹ ہوگی۔ غرضکہ اِس مثال میں صدق کی جانب مرجوح اور عدم صدق کی جانب راجح ہے اس لئے کہا جائیگا کہ یہاں صدق کا وہم اور عدم صدق کا ظن ہے۔ اور اگر دونوں جانب برابر ہو جائیں۔ مثلاً دو چار آدمی کہدیں کہ ہم نے بچشم خود وہ آلہ دیکھا ہے۔ اور اُس کے ذریعہ سے خبریں دریافت کی ہیں اور وہ خبریں صحیح ثابت ہوئیں جس سے صدق کی جانب کو قوت ہو جائے مگر نہ اسقدر کہ احتمال کذب پر اُس کا غلبہ ہو بلکہ دونوں احتمال برابر ہوں تو اُس کو شک اور تردد کہتے ہیں۔ پھر اگر اور چند لوگ گواہی دیں جنکی وجہ سے صدق کا احتمال غالب اور کذب کا احتمال مغلوب

ہو جائے تو کہا جائے گا کہ اُس خبر کے صدق کا ظن اور کذب کا وہم ہے۔ پھر اگر اُس خبر کی صحت پر اتنی گواہیاں پہونچیں کہ انکی تکذیب نہو سکے اور احتمال کذب باقی نہ رہے تو اُسکو یقین کہینگے اِس سے ظاہر ہے کہ یقین اُس کیفیت قلبی کا نام ہے کہ جس میں کسی قسم کا تردد نہو مثلاً اگر کوئی کہے کہ آفتاب روشن ہے۔ تو ہمارے وجدان میں ایک ایسی کیفیت پائی جائیگی جو اُس خبر کی جانب مقابل یعنی روشن نہونے کا خیال بھی آئیگا اور اگر اس قسم کی کیفیت پیدا نہو تو اُسکو یقین نہ کہیں گے۔

اِن چاروں کیفیتوں پر جو آثار مرتب ہوا کرتے ہیں اُنکے مدارج مختلف ہیں۔ مثلاً کسی مسافر سے جنگل میں ایک شخص کہدے۔ کہ اِس راہ میں شیر ہے اور کہنے والا معمولی آدمی ہو تو اُس سے صرف وہم پیدا ہوگا جسکے اثر سے ابتدائی درجہ کا خوف پیدا ہوگا۔ جو اِس خبر کے سننے سے پہلے نہ تھا۔ پھر اگر کسی قرینہ یا دوسرے شخص کے خبر دینے سے اُس احتمال میں قوت پیدا ہو اور شک کی نوبت پہونچ جائے تو خوف بہ نسبت سابق کے زیادہ ہوگا اور کسیقدر احتیاط کی ضرورت معلوم ہوگی پھر اگر دوسرے قرائن یا اخبار سے ظن غالب ہو جائے تو بہ نسبت سابق کے خوف اور زیادہ ہوگا اور مزید احتیاط کی ضرورت داعی ہوگی اور جب متواتر خبروں اور مختلف قرائن سے یقین ہو جائے کہ بیشک شیر اُس راہ میں موجود ہے تو انتہائی درجہ کا خوف طاری ہوگا۔ یہانتک کہ اُس راستہ ہی کو چھوڑ دیگا اور اگر اپنی شجاعت پر پورا بھروسا ہو تو ایسے ہتیار ساتھ لے گا کہ جن سے کامیابی کا یقین ہو غرضکہ کیفیات قلبیہ وجدانی امور ہیں ہر شخص اپنے وجدان سے اُنکا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس قسم کی کیفیت کا وجود ہے۔ جسپر آثار جو ہر کیفیت کے جدا جدا ہوتے ہیں۔ بمنزلہ گواہ ہوں گے مقصود اس تقریر سے یہ ہے کہ جو خبریں قرآن اور احادیث

میں وارد ہیں خواہ خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہوں یا فرشتوں اور امم سابقہ
اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور واقعات آئندہ وغیرہ سے مسلمان کو
چاہیے کہ اُن سب پر ایمان لائے اور غور کرے کہ چوتھے درجہ کی کیفیت یعنی یقین کا وجدان
ہے یا نہیں اگر ہو تو شکر الٰہی بجالائے۔ مگر اُس کے ساتھ یہ بھی دیکھ لے کہ اُس یقین
کے آثار و لوازم بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں مثلاً جب اُس کا یقین ہو کہ خدائے
تعالیٰ علیم اور سمیع وبصیر ہے تو اُس کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ کے خلاف
مرضی کوئی کام نہ کرے۔ کیونکہ اُس یقین کا لازمہ یہ ہے کہ خوف الٰہی پیدا ہو پھر مقتضے
اُس خوف کا یہ ہے کہ اگر کوئی گناہ غفلت سے صادر ہو جائے تو دل میں ندامت
پیدا ہو اور بصدق دل توبہ کرے۔ اگر اس قسم کے آثار پیدا نہوں تو اس لحاظ سے
کہ اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمہ۔ اور بحسب قاعدۂ معقول انتفائے لازم
سے انتفائے ملزوم سمجھا جاتا ہے۔ اُس یقین میں کلام ہوگا۔

اب ایمان کے معنی سنئے کہ علمائے رح نے کیا لکھا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ لفظ ایمان
امن سے ماخوذ ہے جسکے معنی باب افعال میں لے جانے سے امن دینے کے
ہوئے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وآمنهم من خوف۔ یعنی اُن کو خوف سے امن دیا
لسان العرب میں لکھا ہے کہ آمنتُ فانا آمن وآمنتُ غیری من الامن والامان اور
مگر لفظ ایمان تصدیق کے معنی میں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا نام مبارک مومن ہے اسکی
وجہ بعضوں نے لکھی ہے۔ کہ قیامت کے روز اہل ایمان کو امن دے گا اور بعضوں
کا قول ہے کہ اُنکی تصدیق فرمادے گا۔ انتہی ملخصاً۔ بیضاوی شریف میں ہے کہ
ایمان لغت میں تصدیق کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے

والد سے کہا تھا۔ وما انت بمؤمن لنا ولو کنا صادقین یعنے آپ ہماری تصدیق
نہ کروگے اگرچہ ہم صادق ہوں۔ در اصل ایمان بمعنی تصدیق بھی امن ہی سے ماخوذ ہے
اس لئے کہ باب افعال میں لیجانے سے اُس کے معنی امن دینے کے ہوئے۔
اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی کی تصدیق کرتا ہے گویا اُسکو تکذیب اور مخالفت سے امن
دیتا ہے اور بےفکر کر دیتا ہے۔ کذا فی الکشاف وغیرہ۔ چونکہ تصدیق ملزوم اور امن دینا
لازم ہے۔ اس وجہ سے لفظ ایمان کا استعمال تصدیق کے معنی میں مجاز ہوگا از قسم ذکر
لازم و ارادۂ ملزوم۔ لیکن اس صورت میں چاہیے تھا کہ متعدی بنفسہ ہوتا اور آمنتہ کہا جاتا
حالانکہ حرف با کے ساتھ وہ متعدی ہوا کرتا ہے اور آمنت بہ کہا جاتا ہے۔
اس کی وجہ بیضاوی شریف وغیرہ میں یہ لکھی ہے۔ کہ معنے اعتراف و اقرار کی یہاں
تضمین ہے اسلئے کہ جب کسی چیز کی تصدیق کی جاتی ہے تو اُس کا اعتراف اور اقرار
بھی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں آمنت باللہ کے معنی یہ ہوئے کہ میں اللہ تعالیٰ
کے وجود کی تصدیق اور اعتراف کرتا ہوں اس صلہ یعنے حرف با کے التزام سے یہ بتلانا
مقصود ہے کہ مومن بہ کی تصدیق قلبی کے ساتھ اعتراف لسانی بھی ہو۔ علامہ شرنبلالی
نے مراقی الفلاح میں اور کمال ابن ابی الشریف نے مسایرہ شرح مسامرہ میں لکھا ہے۔
کہ امن با کے ساتھ متعدی ہو تو اعتراف و اقرار کی تضمین ہوگی جیسے آمن الرسول
بما انزل الیہ اور لام کے ساتھ متعدی ہو تو اذعان و قبول کی تضمین ہوگی کما قال تعالیٰ فآمن له لوط
شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ ایمان کے معنے کا حاصل صدوق سمجھنا اور اُس چیز کا اعتراف کرنا ہے جس کی تصدیق
کی جاتی ہے اور صادق متکلم کو بھی کہتے ہیں اور کلام کو بھی اسلئے ہر چیز کی تصدیق مختلف اعتبارات
سے ہوگی مثلاً آمنت باللہ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اُن صفات کے

مستعف ہے جو اُس کے لائق ہیں۔ اور آمنت بالرسول کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اور جو کچھ لائے ہیں اُسمیں وہ صادق ہیں۔ اور آمنت بالملائکۃ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کے بندے اور گناہوں سے معصوم ہیں اور آمنت بکتبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے سچے کلام ہیں جو پیغمبروں پر نازل ہوئے ہیں۔ اور آمنت بالیوم الآخر کا یہ مطلب ہے کہ وہ دن ضرور آنے والا ہے۔ اور اُس میں حساب وکتاب اور جزا و سزا ضرور ہوگی۔ اور آمنت بالقدر کا یہ مطلب ہے کہ خیر وشر سب تقدیر اور مشیت سے ہے۔ انتہی ملخصاً علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ نے تہذیب الکلام میں یہ لکھا ہے کہ ایمان لغت میں بمعنی تصدیق واذعان و قبول ہے جسکو فارسی میں گرویدن کہتے ہیں انتہی ملخصاً۔ اذعان کے معنی گردن نہادن ہیں چونکہ ایمان کے معنی میں اذعان معتبر ہے اس سے لازم ہوگیا کہ جس چیز پر ایمان لایا جائے اُس سے سرتابی نہو اور یقینی طور پر قبول کر لیا جائے کہ وہ بات واقعی ہے اور اگر اُس سے ذرا بھی انحراف ہو تو ایمان کا مضمون صادق نہ آئے گا غرضکہ جو مسائل نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں اُن میں یقین کی ضرورت ہے اسی وجہ سے معمولی ایمان والوں کو حکم ہے کہ ایمان لائیں یعنی ایسا یقین کریں کہ اُس پر آثار مرتب ہوں کما قال تعالٰی یا ایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ الآیۃ۔ یہاں یہ بات بھی معلوم کرنیکے لائق ہے کہ ایمان کا ضد اور مقابل کفر ہے اور جس طرح ایمان کا صلہ با کے ساتھ آتا ہے کفر کا صلہ بھی با کے ساتھ آتا ہے اور جس طرح متعلق ایمان جو مدخول با ہے بحسب مناسب مقام مختلف ہوتا ہے متعلق کفر بھی مختلف ہوتا ہے مثلاً کفر باللہ کا مطلب یہ ہے کہ

اوس نے اللہ تعالٰی کی توحید کو یا اُس کے صفات کو نہ مانا اور کفر بالرسول کا یہ مطلب ہے کہ اُن کو خدا کے بھیجے ہوئے نہ سمجھا یا اُنکی رسالت یا اُس چیز کو نہ مانا جو اللہ کی طرف سے پہنچا رہے ہیں علیٰ ہذا القیاس کفر بالاحکام کا یہ مطلب ہے کہ اُن کو من جانب اللہ اور ماموربہا نہ سمجھا۔ مگر اس مقام میں ایک اشکال ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالٰی فرماتا ہے ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین ترجمہ اور جو کوئی منکر ہوا ایمان سے اُس کے اعمال ضایع ہوے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہے۔ اِس آیہ شریفہ میں مدخول با ایمان ہے جس کے معنی یہ ہوے کہ کفر بالایمان باعث حبط اعمال ہے اور وہ درست نہیں اِس لئے کہ اگر کفر بالایمان حرام ہو تو ایمان بالایمان واجب اور باعث نجات ہوگا حالانکہ ایمان پر ایمان لانا کوئی بات نہیں جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ قولہ ومن کفر بالایمان فیہ اشکال وھو ان الکفر انما یعقل باللہ ورسولہ فاما الکفر بالایمان فھو محال فلھذا السبب اختلف المفسرون علی وجوہ یعنے کفر باللہ و بالرسول تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کفر بالایمان محال ہے اسی وجہ سے مفسرین نے اسکے معنے میں اختلاف کیا ہے۔ پھر امام رحمۃ اللہ نے مفسروں کے تین قول بیان کئے جو تینوں قول میں ایمان کے مجازی معنی لئے گئے ہیں ہرچند بات وہی ہے جو امام رحمۃ اللہ نے لکھی ہے مگر ایک توجیہ ایسی بھی ہوسکتی ہے جس میں ایمان کے معنی مجازی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ نفس ایمان پر بھی ایمان لانے کی ضرورت ہے اور اُس کا یہ مطلب ہوگا کہ یقین کرے کہ خدا اور رسول اور جمیع احکام وغیرہ پر ایمان لانا ماموربہ ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ متعلق ایمان کے معنی مناسبت اور ضرورت

لئے جاتے ہیں اُسکی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے نماز پر ایمان لانے کی ضرورت کہ وہ مامور بہ ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے فرض کیا ہے۔ اس ایمان کے وقت ضرور نہیں کہ خارج میں کوئی ایسی چیز ہو جسکو نماز کہیں بلکہ یہ کافی ہے کہ ذہن میں اُن حرکات وسکنات کا مجموعہ ہے جن پر نماز صادق آتی ہے اور یہ تصدیق کیجائے کہ مامور بہ ہے یعنی خدائے تعالیٰ نے اوقات مخصوصہ میں ایسے حرکات وسکنات کے بجالانے کا حکم فرمایا ہے اسیطرح ایمان میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً اذعان وتصدیق وغیرہ جن کا حال انشاء اللہ تعالیٰ ابھی معلوم ہوگا اُن سب کے مجموعہ کا تصور کرکے یقین کیا جائے کہ وہ مامور بہ ہے اُس مجموعہ میں کل تفصیلی تصدیقات اور اُنکے متعلقات کا اجمالی طور پر تصور ہوگا کہ جن چیزوں کی خبر خدائے تعالیٰ نے دی ہے یا حکم فرمایا ہے خواہ وہ مطابق عقل ہوں یا نہوں سب کی تصدیق ضروری ہے پھر اُس مجموعہ میں تصدیق کا بھی تصور ہوگا کہ وہ معمولی تصدیق نہیں بلکہ ایسی ہونی چاہئے کہ شک وشبہہ کا اُس میں دخل ہی نہو غرضکہ تفصیلی تصدیقوں میں جو امور ضروری ہیں وہ سب اس مجموعہ تصوری میں داخل ہوں اور اُس پر یہ حکم لگایا جائے کہ اس قسم کا ایمان مامور بہ ہے بخلاف اسکے اگر کہا جائے کہ خدائے تعالیٰ کا پورا کلام ماننے کی ضرورت نہیں صرف عقل کے مطابق جسقدر ہوں وہ مان لیا جائے اور خلاف عقل باتیں جیسے ابابیل کا ایک لشکر کو ہلاک کرنا اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا شق ہوجانا وغیرہ۔ خوارق عادات جو قرآن شریف میں مذکور ہیں اُنکے ماننے کی ضرورت نہیں جیسا کہ فی زماننا بعضے لوگ کہا کرتے ہیں سو یہی کفر بالایمان ہے جسکی وعید اس آیۂ شریفہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ ایمان کو مومن بہ قرار دینے کی ضرورت

اس وجہ سے ہوئی کہ وہ مامور بہ ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ قل یا اھل الکتاب آمنوا اور یا ایھا الذین آمنوا آمنوا وغیرہ اس سے ثابت ہے کہ ایمان مامور بہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کا حکم خدائے تعالیٰ نے کیا ہو اُس پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ دیکھ لیجئے نماز روزہ۔ حج زکوٰۃ وغیرہ احکام پر جب تک یہ ایمان نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی ہیں اور اون پر عمل کرنے کی ضرورت ہے تو ایمان ہی کیا ہوا۔ الحاصل پہلے مجملاً یہ ایمان لانا اور یقین کرنا ضرور ہے کہ کل قرآن پر ایمان لانے کا ہمیں حکم ہے خواہ وہ موافق عقل ہو یا مخالف اور اگر اُس کا انکار ہو تو ومن یکفر بالایمان صادق آجائے گا۔ ھذا ما سنح لی واللہ اعلم بالصواب۔

مصداق ایمان

یہ تو ایمان کے معنے تھے۔ اب اُس کے مصداق کا حال بھی معلوم کر لیجئے۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں علامہ عینیؒ نے اور تفسیر کبیر میں امام فخرالدینؒ نے لکھا ہے کہ اہل قبلہ ایمان کے مسئلہ میں چار فرقے ہوگئے ہیں ایک فرقہ کا قول ہے کہ ایمان صرف فعل قلبی کا نام ہے۔ پھر اس میں بھی دو مذہب ہیں ایک مذہب محققین جسکو امام اشعری اور اکثر آئمہ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں جسکا علم بالضرورۃ ہوگیا ہے اُس کی تصدیق جازم کا نام ایمان ہے خواہ دلیل سے وہ تصدیق حاصل ہو یا بغیر دلیل۔ علم ضروری کی قید اس غرض سے لگائی گئی کہ جو اجتہادی مسائل ہیں۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ خدائے تعالیٰ بذاتہ عالم ہے یا بعلم سوا ایسے مسائل مسمائے ایمان میں داخل نہیں البتہ اس امر کی تصدیق

ضروری ہے کہ خدائے تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے کیونکہ اس کا ذکر صراحتہً
قرآن وحدیث میں وارد ہے اور تصدیق جازم کی قید اس غرض سے
لگائی گئی کہ تصدیق ظنی ایمان میں کافی نہیں ہوسکتی ہے بلکہ یقین کامل ہونا
چاہئے کہ جو کچھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اوس میں ذرا بھی شک نہ ہو۔
دوسرا مذہب یہ ہے کہ ایمان صرف معرفت قلبی کا نام ہے اُس میں اقرار
کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ بعد معرفت آلہی اگر کوئی شخص زبان سے انکار
بھی کرے اور قبل انکار مرجائے وہ بھی کامل الایمان ہے یہ قول جہیم بن
صفوان کا ہے۔

دوسرے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان عمل زبان کا نام ہے اِسمیں بھی
دو مذہب ہیں غیلان دمشقی اور فضیل رقاشی کا مذہب یہ ہے کہ اقرار
زبانی کے ساتھ معرفت قلبی شرط ہے اور کرامیہ کہتے ہیں کہ اُس کی
ضرورت نہیں مگر منافق کی نسبت اُن کا قول ہے کہ وہ باعتبار ظاہر کے مومن
اور باطن میں کافر ہے اِسلئے دنیا میں مومنوں کے احکام اُس پر جاری ہونگے
اور آخرت میں کافروں کے۔

تیسرے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان عمل قلب ولسان کے مجموعہ کا نام ہے
پھر اِس میں یہ اختلاف ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور عامہ فقہا اور بعض متکلمین کہتے
ہیں کہ ایمان اقرار اور معرفت کی توجیہ اکثر نے یہ کی ہے اور وہی اصح ہے
کہ وہ اعتقاد جازم ہے خواہ تقلیدی ہو یا دلائل سے حاصل ہو اور بعضوں کا
قول ہے کہ وہ معرفت معتبر ہے جو دلائل سے حاصل ہو اس قول پر مقلد کا

ایمان صحیح نہیں ہوسکتا۔

اور اقرار لسانی جو ایمان میں معتبر ہے اُس کی ضرورت ایمان استدلالی میں ہے
ورنہ فیمابینہ وبین اللہ تصدیق کافی ہے اور بشر مریسی اور ابوالحسن
اشعریؒ کا قول ہے کہ وہ تصدیق بالقلب وباللسان ہے اور ایک جماعت
صوفیہ کا قول ہے کہ وہ اقرار باللسان اور اخلاص بالقلب ہے۔ پھر بعضوں نے
اقرار باللسان کو شرط قرار دیا ہے یعنی اصل ایمان سے وہ خارج ہے اسی وجہ
سے جو شخص ماجاء بہ النبی صلی اللہ کی تصدیق کرے فیمابینہ وبین اللہ مومن ہے
اگرچہ زبان سے اقرار نکرے۔

اور حافظ الدین نسفیؒ اور ابومنصور ماتریدیؒ کا قول ہے جسکی طرف اشعریؒ
کا بھی میلان ہے کہ وہ رکن زاید ہے اِسی وجہ سے حالت اکراہ اور عجز میں اقرار
زبانی ساقط ہوجاتا ہے۔

چوتھے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان فعل قلب ولسان وجوارح ہے یعنی دل
سے تصدیق اور زبان سے اقرار اور جوارح سے اطاعت آلہی کا کام لینا اِس
مجموع کا نام ایمان ہے۔ اصحاب حدیث اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ
اور اوزاعی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ اور معتزلہ اور خوارج اور زیدیہ کا بھی یہی
قول ہے۔ پھر اصحاب حدیث نے فعل قلب وجوارح میں اختلاف کیا ہے
عبداللہ ابن سعید کہتے ہیں کہ فعل قلب معرفت آلہی ہے اور وہی ایمان کامل ہے
اور اوس کے بعد اطاعت علیحدہ ایمان ہے اور جحود اور انکار قلب کفر ہے
پھر ہر معصیت علیحدہ کفر ہے لیکن جب تک معرفت اور اقرار نہو کوئی اطاعت

ایمان نہیں ہو سکتی اور جب تک جحود و انکار نہو کوئی معصیت کفر نہیں اسلئے
اصل طاعت ایمان ہے اور اصل معاصی کفر ہے اور فروغ کا وجود بغیر اصل کے
نہیں ہو سکتا۔

بعضے کہتے ہیں کہ ایمان تمام طاعت کا نام ہے خواہ فرائض ہوں خواہ نوافل
اور وہ سب ملکر ایک ایمان ہے مگر جو شخص کوئی فرض چھوڑ دے تو اُسکا ایمان
ناقص ہوگا اور نوافل کے چھوڑنے سے نقص نہ ہوگا اور بعضے کہتے ہیں کہ ایمان
صرف ادائے فرائض کا نام ہے۔

پھر معتزلہ کے اقوال مختلف ہیں واصل ابن عطار اور ابو ہذیل اور قاضی عبد الجبار
کا قول ہے کہ ایمان ہر طاعت کی ادائی کا نام ہے خواہ واجب ہو یا مستحب اور
خواہ از قسمِ اعتقادات ہو یا اقوال و افعال۔ ابو علی جبائی اور ابو ہاشم کا قول ہے کہ
وہ فقط ادائے واجبات کا نام ہے اور نظام کا قول ہے کہ جس گناہ کے باب
میں وعید وارد ہے اُس سے اجتناب کرنے کا نام ایمان ہے اور اُسکے بعض
اصحاب کا قول ہے کہ ایمان کی شرط ہر کبیرہ سے بچنا ہے۔ اور خوارج کا اتفاق اِس
بات پر ہے کہ ایمان اِن امور کے مجموعہ کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اور اُن چیزوں کی معرفت
حاصل ہو جن پر دلیل عقلی یا نقلی قایم ہے اور اطاعت الٰہی اُن امور میں جن کے کرنے
یا نکرنے کا حکم وارد ہے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے مذہب خوارج معتزلہ کے مذہب سے
قریب قریب ہے اور ان دونوں کے قریب مذہب سلف و اہل حدیث ہے
جنکے نزدیک تصدیق بالجنان و اقرار باللسان و عمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ایمان
ہے مگر فرق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طاعت کو ترک کرے خواہ افعال سے ہو یا

اقوال سے معتزلہ کے نزدیک وہ ایمان سے خارج ہوتا ہے لیکن کفر میں داخل
نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے بین بین رہتا ہے جس کو وہ منزلة بين المنزلتين کہتے
ہیں اور خوارج کہتے ہیں کہ طاعت کے چھوڑتے ہی آدمی کفر میں داخل ہو جاتا ہے
کیونکہ ایک طاعت کا بھی ترک اُنکے نزدیک کفر ہے اور سلف کے نزدیک وہ ایمان
سے خارج نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ ایمان تصدیق اور اقرار اور
عمل کا نام ہے مگر مدارج مختلف ہیں جو تصدیق نہ کرے وہ منافق ہے اور جو
اقرار نہ کرے وہ کافر ہے اور جو عمل نہ کرے وہ فاسق ہے اگرچہ دوزخ میں جائیگا
مگر ہمیشہ اُس میں نرہے گا۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اہل اسلام کے جتنے فرقے ہیں سب کے نزدیک یہ مسلم ہے
کہ جن چیزوں پر ایمان لانے کا حکم قرآن اور حدیث سے ثابت ہے مثلاً خدائے
تعالےٰ کی ذات و صفات اور وجود ملائکہ اور رسالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا
علیہم السلام اور قیامت اور جزا و سزا اور مسئلہ تقدیر جنکی تفصیل صفت ایمان میں
مذکور ہے اِن سب امور کی تصدیق کی ضرورت ہے اور تصدیق بھی کیسی کہ جازم ہو اور
بعضوں نے تو معرفت کی بھی ضرورت تبلائی جسکا مرتبہ تصدیق سے بھی زیادہ ہے۔
البتہ بعضوں نے ایمان کو عمل زبان کہا ہے مگر اُنکے نزدیک بھی تصدیق قلبی شرط ہے
اور کرامیہ گو اُس کی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اقرار لسانی کو ایمان کہتے ہیں مگر اُن کا
بھی یہی مطلب ہے کہ بغیر تصدیق قلبی کے اخروی نجات حاصل نہیں ہو سکتی
اگرچہ دنیا میں لوگ زبانی اقرار کرنیوالے کو مومن سمجھیں گے۔ اور معتزلہ نے
تو ایمان کے مسئلہ میں نہایت ہی تشدد کیا ہے کہ علاوہ تصدیق و اقرار کے عمل کو

اصل ایمان ہی میں داخل کردیا چنانچہ جو شخص نماز وروزہ وغیرہ امور شرعیہ کو ادا نہ کرے
اُس کو وہ ایمان ہی سے خارج کردیتے ہیں۔ اور جہمیہ نے اسقدر تشدد کیا کہ ایمان معرفت
کا نام رکھا جو کبھی زایل نہ ہوسکے اسیوجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بعد معرفت
زبان سے اقرار نہ کرے اور انکار ہی کرتا رہے جب بھی وہ کامل الایمان ہے
اسلئے کہ معرفت ایسی قوی چیز ہے کہ انکار سے زائل نہیں ہوسکتی کمافی
الملل والنحل للشہرستانی الحاصل کل فرقہ اسلامیہ کے نزدیک
مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ احکام بیان فرمائے ہیں اون کی
جزاوسزا کی جزمی تصدیق ایمان میں معتبر ہے اور بغیر اسکے کسی فرقہ کے نزدیک وہ
ایمان جو باعث نجات اخروی ہو صادق نہیں آسکتا۔ اب خیال کیا جائے کہ تحصیل
تصدیق میں کسقدر اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جسکو
کامل اور جزمی تصدیق امور مذکورہ کی ہوگی وہ شخص خدا اور رسول کی طاعت میں کسقدر
جان فشانی اور جان بازی کرے گا۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ جب کوئی مستقل بیدار مغز
بادشاہ شاہی احکام اپنی قلمرو میں نافذ کرتا ہے اور ہر ایک کام کے کرنے اور نہ کرنے پر
جزاوسزا مقرر کرکے ایک دستور العمل مرتب کرتا ہے تو اسکی رعایا امتثال اوامر و
اجتناب نواہی میں کیسی سرگرم ہوجاتی ہے کہ اگرچہ کسی کام میں اُن کا سراسر
نقصان ہوا اور اُسکے کرنے یا ترک کرنے میں کتنی ہی مشقت ہو مگر خلاف حکم وہ
کوئی کام نہیں کرسکتے وجہ اسکی کیا ہے وہی ایک تصدیق اور یقین ہے کہ اگر
عدول حکمی کریں گے تو مستحق سزا ہوں گے اب اسی پر قیاس کیجئے کہ جسکو یقین ہو کہ
احکام الٰہی کے نہ ماننے یا پابندی نہ کرنے میں سزا ہوگی اور دوزخ میں جانا ہوگا جس میں

اقسام کے عذاب ہیں اور امتثال اوامر میں استحقاق جنت ہے جس میں بے انتہا نعمتیں
ہیں اور ابدالآباد وہ اس میں رہے گا تو وہ کسقدر احکام الٰہی کی پابندی کرے گا۔ اب
یہاں قابل توجہ یہ بات ہے کہ جتنی پابندی احکام شاہی کی کیجاتی ہے اگر احکام الٰہی
کی اتنی بھی پابندی نہو تو کس طرح سمجھا جائے کہ ابدی جزا وسزا کی تصدیق اور
یقین کیا گیا ہے پھر اگر یقین ہی میں کلام ہو تو اہل ایمان میں شامل ہونے کی کیا صورت
اس لئے ہر مسلمان کو ضرور ہے کہ اپنی تصدیق اور ایمان میں غور و فکر کیا کرے اور
اسکو اس حد تک پہونچائے کہ جملہ احکام شرعیہ کی پابندی نفس پر آسان ہوجائے
کیونکہ جب یقین اس امر کا ہوجائے کہ نماز کو ترک کرنے سے آدمی دوزخ کا مستحق ہوجاتا ہے
تو دن رات میں پانچ نمازیں ادا کرنا اوسکے مقابلہ میں کوئی مشکل بات نہیں۔
اسی طرح سال بھر میں ایک مہینے کے روزے رکھ لینا اور سو روپیہ جمع ہوں
اور سال بھر رہیں تو ڈھائی روپیہ اُسکی زکوٰۃ یک مشت یا بدفعات اپنے مفلس
قرابتداروں یا فقرا کو دینا۔ اور عمر بھر میں ایک بار حج کو جانا اُن آفتوں کے
مقابل کون سی بڑی بات ہے آج کل مذہب معتزلہ وقعت کی نظروں سے
دیکھا جارہا ہے یہانتک کہ بعض لوگ تو صاف کہدیتے ہیں کہ ہم معتزلی ہیں وجہ
اوسکی یہی ہوگی کہ آج کل حکمت کا مذاق غالب ہے، اور معتزلہ نے حکما کو اکثر مسائل
میں اپنا پیشرو بنالیا تھا اکثر وہ انہیں کے دلائل سے مدد لیتے ہیں مگر غور کرنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن حضرات کو معتزلہ کے مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں اسلئے
کہ معتزلہ نے عمل کے باب میں یہانتک سختی کی ہے کہ نفس ایمان اسی کو قرار دیا ہے
چنانچہ شرح مواقف [illegible] انکا قول نقل کیا ہے کہ [illegible] واجبات دین ہے

اور دین اسلام ہے - اور اسلام ایمان ہے - جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ادائے واجبات
ایمان ہے اور ان دعووں کے دلائل میں وہ آیات قرآنیہ پیش کرتے ہیں -
چنانچہ ادائے واجبات کا اسلام ہونا اس آیت سے ثابت کرتے ہیں -
ویقیموا الصلوٰة ویوتوا الزکوٰة وذالک دین القیمہ
اور قایم کریں نماز اور دیں زکوٰة اور یہ ہے اور راہ مضبوط لوگوں کی " اس سے
ظاہر ہے کہ نماز ادا کرنا اور زکوٰة دینا ملت قیمہ یعنی مسلمانوں کا دین ہے اور دین کا
اسلام ہونا اس آیہ شریفہ سے ثابت ہے ان الدین عند اللہ الاسلام
اور اسلام کا ایمان ہونا اس آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے ومن یبتغ غیر الاسلام
دینا فلن یقبل منہ یعنی جو شخص سوائے اسلام کے کوئی دین طلب کرے
تو اس سے وہ دین قبول نہ کیا جائے گا جس سے ظاہر ہے کہ غیر اسلام اگر
ایمان ہو تو وہ قابل قبول نہیں - اور اس آیت سے بھی ثابت کرتے ہیں قولہ
تعالیٰ فاخرجنا من کان فیہا من المومنین فما وجدنا
فیہا غیر بیت من المسلمین پس نکال دیا ہم نے اس بستی سے جتنے اس میں ایمان
والے تھے اور ہم نے مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا اسمیں پایا نہیں "
سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ مستثنیٰ بیتا من المومنین ہے اور تقدیر یہ
ہوگی فما وجدنا بیتا من المومنین الا بیتا من المسلمین جس سے ظاہر ہے کہ مومن
وہی ہیں جو مسلمین ہیں - غرضکہ نماز روزہ حج زکوٰة وغیرہ اوامر کو بجالانے اور شراب خواری
اور ربوا وغیرہ کبائر سے اجتناب کرنے میں اونھوں نے حد سے زیادہ تشدد کیا ہے
چنانچہ ابن حزم اور شہرستانی نے ملل اور نحل میں انکا عقیدہ بیان کیا کہ اگر کوئی عمر بھر

عبادت کرے مگر کبھی ایک کبیرہ کا مرتکب ہوا کرتا ہو یا ایک نماز یا روزہ قصداً ترک
کرے اور قبل توبہ مر جائے تو وہ قطعاً دوزخی ہے اور فرعون اور ابولہب کے
ساتھ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا پھر اگر خدائے تعالیٰ بھی اسکو دوزخ سے نکالنا
چاہے تو نہ نکال سکے گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس قدر ان کو اہتمام
ہے کہ اگر کوئی شخص کہنے سننے سے نہ مانے تو تلوار سے اس کو منانا
چاہیے -

دیکھئے دینی معاملات اور اعمال کی طرف کسقدر انکی توجہ مبذول ہے - ہمارے
معاصرین گو معتزلی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مذہب معتزلی کی تعریف کرتے ہیں
اور عملی ثبوت بھی دیتے ہیں کہ مختلف فیہ مسائل میں معتزلہ کے دلائل سے
اہل سنت وجماعت کے مذہب کو رد کرتے ہیں مگر اونکے عمل کی جانب نگاہ
ڈالی جاتی ہے تو اوس کا نام تک نہیں سنا جاتا پھر اون کو معتزلی کیونکر سمجھا جائے
ادنی توجہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ نہ وہ سنی ہیں نہ معتزلی نہ شیعی وغیرہ
صرف مسلمانوں کی دل آزاری اور تفرقہ اندازی کی غرض سے رد وقدح کا بکھیڑا اور
جھگڑا لگا رکھا ہے - خیر حق تعالیٰ ہم کو اور ان کو نیک توفیق عطا فرماوے -
قصد السبیل میں لکھا ہے کہ ایمان شرعی کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام پہونچائے ہیں اور ضروری طور پر ان کا
علم ہوا ہے انکی تصدیق اس طور سے کیجائے کہ جو امور تفصیلاً معلوم ہوئے ہیں
ان کی تصدیق تفصیلاً اور جو اجمالاً معلوم ہوئے انکی تصدیق اجمالاً ہونا خواہ وہ دلیل سے
حاصل ہو یا بغیر دلیل کے لیکن یہ ضروری امر ہے کہ تصدیق جزئی ہو -

تعریف میں جو قید لگائی گئی کہ جو امور کہ ضروری طور سے معلوم ہوئے ہوں اُس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسکو عوام الناس بھی سمجھ سکتے ہیں اور اُنکے معلوم کرنے میں نظر و فکر کی ضرورت نہیں جیسے وحدانیت اور نبوت اور نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ۔ بخلاف اُن مسائل کے جو اجتہاد سے معلوم ہوتے ہیں اور تفصیلی امور سے مراد وہ امور ہیں جنکا ذکر مفصلاً ہوا ہے جیسے ملائکہ میں جبرئیل و میکائیل وغیرہ اور انبیا میں موسیٰؑ و عیسیٰؑ وغیرہ علیہم السلام اور کتابوں میں توراۃ انجیل وغیرہ اور اجمالی امور سے مراد وہ امور ہیں جنکی تفصیل معلوم نہو جیسے کل انبیاء اور کل کتب و ملائکہ اسمیں اسیقدر ضرورت ہے کہ کہے ہم سب پر ایمان لائے۔

حاصل یہ کہ جن چیزوں کا وجود ظاہری طور اس طرح ثابت ہے کہ عوام الناس بھی سمجھ لیتے ہیں جیسے فرشتوں کا وجود کہ اُن کا آسمانوں سے اُترنا اور چڑھنا وغیرہ امور قرآن شریف میں بیان کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اُن کا وجود مستقل ہے وہ ہمارے قوٰی نہیں ہیں ایسے امور پر ایمان لانے کی ضرورت ہے اگر کوئی تاویلیں کر کے کہے کہ فرشتے بھی ہمارے قوٰی ہیں انکے سوا کوئی چیز نہیں تو سمجھا جائے گا کہ وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا۔

تصدیق

ایمان میں جونکہ تصدیق معتبر ہے اس لئے ضرور ہے کہ اُسکے بھی معنی سمجھ لئے جائیں

کشاف الاصطلاحات میں لکھا ہے کہ لغت میں تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ کسی قائل کیطرف صدق کی نسبت کیجائے خواہ وہ دل سے ہو یا زبان سے اور تصدیق معرفت میں یہ فرق ہے کہ تصدیق ضد انکار ہے اور معرفت ضد جہالت و نکارت امام غزالیؒ نے جو لکھا ہے کہ تصدیق تسلیم کرنے کا نام ہے اسمیں اسی طرف اشارہ ہے اسلئے کہ تسلیم انکار اور استکبار کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی! امام غزالیؒ نے اسکی تفصیل سطح کی ہے کہ تصدیق ربط قلبی کا نام ہے جو امر کسبی ہے کہ مصدق اپنے اختیار سے کرتا ہے اسیواسطے لوگ ایمان کے امور ہیں اور اسپر ثواب حاصل ہوتا ہے اور وہی تصدیق تمام عبادتوں کا سر ہے بخلاف معرفت کے کہ وہ بغیر اختیار کے ہی حاصل ہوسکتی ہے جیسے کسی دیوار یا پتھر پر نظر پڑتی ہی بے اختیار معرفت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ دیوار یا پتھر ہے۔ اور تصدیق میں خصوصاً تصدیق شرعی میں واجب ہے کہ وہ کسبی ہو

ملا عبد الحکیمؒ نے حاشیہ خیالی کی بحث ایمان میں لکھا ہے کہ اسپر تو اتفاق ہے کہ معرفت مذکورہ تصدیق لغوی سے خارج ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا وہ تصور میں داخل ہے یا تصدیق منطقی میں صدر الشریعہؒ لکھتے ہیں کہ وہ تصدیق منطقی میں داخل ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ تصور ہے انتہیٰ۔

حاصل یہ کہ ایمان میں جو تصدیق معتبر ہے معرفت پر صادق نہیں آتی اسلئے کہ اہل کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری معرفت حاصل تھی کہ آپ نبیؐ ہیں اسلئے کہ کتب سابقہ میں حضرتؐ کے شمائل و حالات برابر مذکور ہیں جنکے مطابق اونھوں نے حضرتؐ کو پایا پھر ولادت شریف کے زمانہ میں کاہنوں کا خبر دینا کہ آپ کا ظہور قبیلۂ قریش میں ہوگیا اور ہر طرف ہاتفوں کی پکار کہ نبی آخر الزمان پیدا ہوگئے اور بتوں کا سر بسجود ہوجانا وغیرہ حیرت انگیز امور جو ولادت

شریف کے وقت اور اُسکے قبل وبعد ظہور میں آئے جو کتب احادیث میں مصرح ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر معمولی حرکات وسکنات اور جامع فضائل صوری ومعنوی ہونا جو خاصہ منتخب افراد انسانی اور انبیا کا ہے یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں مجتمع ہوں ممکن نہیں کہ وہ معمولی آدمی سمجھا جاوے بلکہ وہ آپ کے رتبہ عالیہ کی طرف توجہ دلانے میں کافی ووافی تھے پھر جب آپ نے دعوئی نبوت کیا اور وقتاً فوقتاً معجزے دکھانے لگے جنکا ظہور قدرت مخلوق سے خارج اور خاص قدرت الٰہی سے متعلق ہے اور کلام الٰہی پڑھ پڑھ کر سنانے لگے جس میں علاوہ تاثیرات روحانیہ کے فصاحت وبلاغت میں بھی اس درجہ پر ہے کہ تمام جن وانس اُس کے جیسا کلام بنانے سے عاجز ہیں اور باوجود اس عام اعلان کے فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین فصحائے عرب دم نہ مار سکے تو بتائے کہ اتنے براہین قاطعہ اور مشاہدات کے بعد ایسا کون بلید الذہن اور پاگل ہوگا کہ اُسکو معرفت حاصل نہ ہوئی ہو غرضکہ عموماً کفار خصوصاً اہل کتاب کو حضرتؐ کی معرفت ضرور حاصل تھی چنانچہ خود حق تعالیٰ اوسکی گواہی دیتا ہے کما قال تعالیٰ الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم یعنے جس طرح ہر روز دیکھنے سے اپنے لڑکوں کی معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے کہ آدمی ہزار لڑکوں میں اپنے لڑکے کو پہچان لیتا ہے اسی طرح کثرت علامات وامارات ومعجزات کی وجہ سے اہل کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہیں کہ وہ نبی آخر الزماں ہیں۔ دیکھئے باوجود اتنی معرفت کے انکو مسلمان نہیں کہہ سکتے اسلئے کہ تصدیق لغوی ان میں نہیں پائی گئی کیونکہ وہ تکبر اور

عناد کی راہ سے گویا یہ بات کہتے تھے کہ یہ سب کچھ سہی مگر ہم تصدیق کی نسبت انکی طرف کبھی نہ کرینگے کہ وہ اپنے دعووں میں صادق ہیں اگرچہ مقتضی اس معرفت کا یہ تھا کہ وہ تصدیق کر لیتے مگر تعصب مذہبی نے انکو اس سے روکا اور کافر کے کافر رہے اور وہ معرفت بیکار گئی بلکہ وہی وبال جان ہوئی کیونکہ جان بوجھ کر ایمان نہ لانیوالا بہ نسبت نادان کے زیادہ مواخذہ کے قابل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس معرفت ایمان نہیں بلکہ اُسکے بعد اپنے قصد سے ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

محقق تفتازانیؒ نے شرح مقاصد میں بعض متاخرین کا قول نقل کیا ہے کہ ایمان میں معتبر وہ تصدیق ہے جو اختیار سے حاصل ہو یعنی متکلم کیطرف صدق کی نسبت اختیار سے کیجائے اختیار کی قید اس غرض سے لگائی گئی کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی سے جدا ہوجائے اسلئے کہ تصدیق منطقی کبھی بغیر اختیار کے بھی ہوتی ہے مثلاً انبیا علیہم السلام جب نبوت کا دعوئی کرکے معجزات دکھاتے تو بعضوں کو انکا صدق بے اختیار دل میں واقع ہوجاتا تھا باوجود اسکے انکا تصدیق کرنا بحسب لغت صادق نہیں آتا اسلئے وہ شرعاً بھی ایمان نہیں ہوسکتا

اصل یہ ہے کہ تصدیق مامور بہ ہے اوسکا مقدور اور اختیاری ہونا ضرور ہے اور وہ کیفیت جو اُن کے دلمیں پیدا ہوگئی تھی وہ اختیاری نہ تھی بلکہ ایک علم تھا جسکو کیفیت نفسانی کہتے ہیں یا انفعال یعنی قلب میں اس معنی کا حصول بہرحال اُسپر فعل قلبی صادق نہیں آتا جو مامور بہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ تصدیق علم پر ایک زائد چیز ہے اُسمیں یہ ضرور ہے کہ اختیار سے ایقاع نسبت ہو جسکو کلام نفسی اور عقد قلب کہتے ہیں ہر چند سوفسطائی وجود نہار کا عالم ہو مگر اُسکو لغۃً مصدق نہیں کہہ سکتے اس طرح کفار مذکورین گو جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں مگر انکو مصدق نہیں کہہ سکتے اسلئے کہ

انھوں نے وہ حکم اختیار سے نہیں کیا تھا اور بجائے تصدیق کرنے کے ہمیشہ منکر رہے
الغرض شرعی تصدیق منطقی تصدیق نہیں ہے۔ محقق مذکور نے اس قول کو نقل
کر کے اُسپر چند اعتراض کئے ہیں۔

(۱) مامور بہ کے مقدور و اختیاری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مقولہ کیفیت سے ہو
بلکہ یہ کافی ہے کہ اُسکے ساتھ قدرت کا تعلق صحیح ہو اور حصول اُسکا کسب اور اختیار
سے ہو سکے خواہ مامور بہ فی نفسہ اوضاع اور ہیأت سے ہو جیسے قیام و قعود یا کیفیات
سے جیسے علم و نظر حق تعالیٰ فرماتا ہے فاعلم انہ لا الٰہ الا ھو۔ فانظر ماذا
فی السموات۔ اِن دونوں آیتوں میں مامور بہ علم و نظر ہیں جو کیفیات سے ہیں۔ یا
حرکات و سکنات سے جیسے نماز یا ترک ہو جیسے روزہ باوجودیکہ یہ امور مقولہ فعل سے
نہیں ہیں مگر مامور بہ ہیں اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیفیت قلبیہ مامور بہ ہے جسکے ساتھ
قدرت کا تعلق صحیح ہے اور اگر مامور بہ کا فعل بمعنی تاثیر ہونا لازم و ضروری ہو تو ہم کہہ سکتے
ہیں کہ ایمان کا واقع کرنا اور اُسکا اکتساب و تحصیل مامور بہ ہے جیسے تمام واجبات میں
ہوا کرتا ہے اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایمان مقولہ فعل سے ہو بلکہ اُسکا واقع کرنا مقولہ
فعل سے ہوگا نہ نفس ایمان۔

(۲) کوئی ضرورت نہیں کہ ہم تصدیق منطقی سے تصدیق لغوی کو علیحدہ اور ممتاز
کریں خود شیخ نے جو فن منطق میں مقتدا ہے تصریح کی ہے کہ تصدیق منطقی جو علم کی
ایک قسم ہے وہ بعینہ تصدیق لغوی ہے جسکی تعبیر فارسی میں گرویدن سے کیجاتی ہے
اور مقابل تکذیب کے ہے چنانچہ دانش نامہ علائی میں لکھا ہے۔ دانش دو گونہ است
یکی دریافتن و دررسیدن و آن را تازی تصور خوانند و دوم گرویدن و آن را تازی

تصدیق خوانند۔ اِس سے ظاہر ہے کہ تصدیق منطقی اور لغوی دونو ایک ہی ہیں اور
شفا میں لکھا ہے۔ التصدیق فی قولك البیاض عرض ھو ان یحصل فی
الذھن نسبة صورة ھذا التالیف الی الاشیاء انھا مطابقة لھا
والتکذیب یخالف ذالك اِس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ
تصدیق نسبت تامہ کا ذہن میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بعضوں نے سمجھا ہے
بلکہ مقصود اُنکا یہ ہے کہ تصدیق حصول اِس امر کا ہے کہ طرفین مولف کے درمیان جو
نسبت ثبوتی یا سلبی ہے اُسکو ذہن نفس الامر کی طرف نسبت کرے کہ یہ نسبت
واقع کے مطابق ہے جسکی تعبیر فارسی میں صادق داشتن و گرویدن ہے چنانچہ صاف
لکھا ہے کہ وہ ضد تکذیب ہے جسکے معنی فارسی میں کاذب داشتن ہیں اِس تقریر سے وہ
اعتراض بھی دفع ہو گیا کہ حکم جب فعل اختیاری ہے یعنی ایقاع و انتزاع تو وہ نفس تصدیق
یا جز تصدیق کیونکر ہو سکتا ہے اسلئے کہ تصدیق علم کی قسم ہے جو مقولہ کیف یا انفعال سے
ہے ممکن نہیں کہ وہ مقولہ فعل سے ہو سکے۔ اِس اعتراض کا جواب تقریر سابق سے
یہ سمجھا گیا کہ تصدیق شیخ کے نزدیک حصول ذہنی کا نام ہے نہ فعل ذہن کا۔ اور کسی نے
کیا خوب کہا ہے کہ اسناد و ایقاع وغیرہ الفاظ و عبارات ہیں درحقیقت نفس کا
وہاں کوئی فعل نہیں ہے بلکہ صرف اذعان و قبول ہے اور ادراک اِس امر کا ہے
کہ نسبت واقع ہے یا نہیں۔ البتہ اس تصدیق کا حصول کبھی کسب سے ہوتا ہے کہ
اسباب و اختیار کام میں لائے جاتے ہیں مثلاً ذہن و حواس و نظر کو متوجہ کرنا اور کبھی بغیر
اسکے جیسے دھوپ پڑتے ہی آدمی خود سمجھ جاتا ہے کہ آفتاب نکلا ہے لیکن مامور بہ کیلئے
ضرور ہے کہ قسم اول سے یعنی اختیاری ہو۔ اس تقریر پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب یقین

کے ساتھ اذعان وقبول نہو بلکہ جحود وانکار ہو جیسے سوفسطائی اور کفار کا یقین تھا تو اسکو تصور کہنا چاہئے کیونکہ تصدیق میں اذعان کی ضرورت ہے حالانکہ اسکو تصور کہنا صریح البطلان ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہاں ہمارا دعویٰ اسیقدر ہے کہ منطقیوں کے رئیس نے جو تصدیق کی تفسیر کی ہے وہ تصدیق لغوی اور مقابل تکذیب ہے پھر مطلقاً یہ کہنا کہ ایمان میں تصدیق منطقی معتبر نہیں ہے درست نہیں۔ غایۃ الامر یہ ہے کہ ایمان میں اور بھی چند شرائط معتبر ہیں۔ رہا یہ کہ شیخ کی تفسیر پر یہ لازم آتا ہے کہ جس یقین کیساتھ اذعان وقبول نہوں وہ تصور ہوگا یا تصور وتصدیق دونوں سے خارج ہوگا سو یہ بحث دوسری ہے۔

(۳) التصدیق کے معنی جو کیے جاتے ہیں کہ وہ دل سے متکلم کی طرف صدق کی نسبت کرنا ہے اُسکے معنی سوائے اِسکے کہ متکلم کے صادق ہونے کا ادراک اور اذعان ہو اور کیا ہو سکتے ہیں کیونکہ اس تصدیق کے وقت سوائے اُس ادراک کے قلب کا اور کوئی فعل اور تاثیر خیال میں نہیں آتی اِس سے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ نفس کی ایک کیفیت ہے جو کبھی کسب واختیار ومباشرت اسباب سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی بغیر اسکے۔

غایۃ الامر یہ ہے کہ ایمان میں جو کیفیت قلبی معتبر ہے وہ کسبی ہے۔ اسلئے کہ ایمان مامور بہ ہے اور مامور بہ کا اختیار سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایمان و تصدیق مقولہ فعل سے ہوں تو یہ کہنا پڑے گا کہ آدمی صرف حالت مباشرت تحصیل میں حقیقۃً ایمان کیساتھ متصف ہے جیسا کہ مقولہ فعل کے معنی سے یہ بات ظاہر ہے۔

(۴) اکابر دین کے کلام میں لفظ تصدیق کی جگہہ معرفت وعلم واعتقاد بھی مستعمل ہیں

چنانچہ علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایمان معرفت ہے اور معرفت تسلیم اور تسلیم تصدیق ہے اسلئے چاہئے کہ تصدیق جو بمعنی گرویدن ہے وہ بھی علم ہی کے معنی میں ہو تاکہ سب ایک جنس ہو جائیں۔ البتہ ایمان میں قیود وشرط ہیں جیسے تحصیل و اختیار و ترک جحود و استکبار۔ انتہی ملخصاً۔

اگرچہ محقق کی تقریر سے معلوم ہوا کہ تصدیق لغوی ومنطقی ایک ہی ہیں مگر یہاں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بعض متاخرین نے جنکی تقریر محقق رح نے نقل کی ہے تصدیق شرعی یعنی لغوی کو تصدیق منطقی سے کیوں علیحدہ کیا منشا اسکا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق منطقی علم کی قسم ہے جو منطقین کے نزدیک ظنیات پر بھی شامل ہے۔ چنانچہ کشاف الاصطلاحات میں لکھا ہے التصدیق اللغوی قطعی والمنطقی اعم من القطعی والظنی لکونہ من العلم الشامل للظنی والقطعی عند المنطقیین اور مولانا فضل حق رح نے حاشیہ قاضی میں لکھا ہے کہ تصدیق ضعیف بھی ہوتی ہے اور شدید اور اشد بھی۔ ضعیف جیسے ظن۔ اور شدید جیسے تقلید۔ اور اشد جیسے یقین۔ اور مشائین کے نزدیک مسلم ہے کہ شدید اور ضعیف مختلف الانواع ہوا کرتے ہیں اس وجہ سے تصدیق کے تحت میں مختلف انواع ہوں گے غرضکہ منطق میں چونکہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ علم کی دو قسم ہیں تصور وتصدیق اور تصدیق ظنی بھی ہوتی ہے اور تصدیق ایمانی ظنی نہیں ہو سکتی بلکہ اسکا یقین ہونا شرط ہے اسوجہ سے بحث ایمان میں بھی ضرور ہوا کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی سے بالکل علیحدہ کرلی جائے تاکہ یہ وہم بھی نہو کہ تصدیق ظنی بھی ایمان کے لئے کافی ہے۔ مراقی الفلاح میں شرنبلالی نے لکھا ہے المومن ھو الذی یحقق بقلبہ دین الاسلام اعتقادا

جازماً خالیاً عن الشک یعنی مومن وہی ہے جو دل سے دین اسلام کا جزمی اعتقاد رکھے جس میں کسی قسم کا شک نہو علامہ تفتازانی رح نے تہذیب الکلام میں لکھا ہے کہ جب تصدیق یہ ٹھہری کہ اذعان اور قبول کے ساتھ یقین ہو جو اختیار و کسب سے حاصل ہوجاے تو یہ لازم آئے گا کہ جو یقین کہ اذعان سے خالی ہو۔ (جیسے سوفسطائی اور بعض کفار کا یقین) تصدیق نہو بلکہ تصور ہو یا تصور و تصدیق کے بیچ میں واسطہ ثابت کیا جاے اور جو یقین مقارن اذعان بغیر کسب کے حاصل ہوا ہو جیسے ملائک اور انبیا علیہم السلام کا یقین اسکو مکتسب کہیں یا یہ کہا جاے کہ دوبارہ اُس کو اختیار سے حاصل کرنے کی انہیں ضرورت ہے حالانکہ یہ سب لوازم محل تامل ہیں۔ انتہی

شیخ وسم کردستانی نے اُس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ سب خرابیاں اس وجہ سے لازم آرہی ہیں کہ تصدیق ایمان عموم وخصوص میں منطقی تصدیق کے مساوی بتائی جارہی ہے حالانکہ تصدیق منطقی عام ہے جس میں ظنیات شامل ہیں اور تصدیق شرعی ولغوی خاص جسکا قطعی ہونا شرط ہے۔ اگر ایمان کی تعریف یوں کی جاتی کہ تصدیق منطقی کی جنس سے ہے۔ مگر اُس میں اور بھی چند شرائط ہیں کہ اعتقاد جازم اختیار سے حاصل کیا جائے اور جحود و استکبار سے خالی ہو تو غیر اذعانی یقین (جو سوفسطائی اور کفار کو تھا) اُسکو نہ تصور کہنے کی ضرورت ہوتی نہ واسطہ ثابت کرنے کی بلکہ وہ تصدیق ایمانی سے خارج اور تصدیق منطقی میں داخل رہتا۔ تعریف مذکور میں ایمان کو تصدیق منطقی کی جنس سے کہنے کی ضرورت اسوجہ سے ہوئی کہ بعضوں نے اسکو کلام کہا ہے اور بعضوں نے تنفعل نفس حالانکہ وہ بھی ایک قسم کی تصدیق جنس علم سے ہے جو مقولہ کیف

مستعمل

ہے اصل منشاء اس اضطراب کا یہ ہے کہ اذعان دو معنی میں مستعمل ہے مرادف تصدیق منطقی اور بمعنی تسلیم و ترک جحود و استکبار چونکہ دونوں تصدیقوں میں یہ لفظ مستعمل ہے اس لئے اشتباہ ہوا کہ سوفسطائی کو اذعان نہیں حالانکہ اذعان منطقی وہاں موجود ہے البتہ وہ اذعان نہیں جو ایمان میں معتبر ہے۔ انتہی

محقق تفتازانی رح کو شرح مقاصد میں اصرار ہے کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی ہے یعنی علم اور مقولہ کیف سے ہے اور جو دشواریاں اُس میں واقع ہوتی ہیں اُن کو تہذیب الکلام میں بیان کردیا محشی کردستانی نے جو اُنکے دفع کرنے کی فکر کی وہ محقق رحمہ اللہ کے کلام سے مستفاد ہے چنانچہ یہ اُن کا قول ابھی معلوم ہوا کہ غایۃ الامر یہ کہ ایمان میں اور بھی چند شرائط معتبر ہیں مگر ہنوز اُس میں کلام کو گنجائش ہے۔

محقق نے دوسرے اعتراض میں جو اوپر مذکور ہوا لکھا ہے فلم یجعل الشیخ التصدیق حصول النسبۃ التامۃ فی الذھن علی ما یفھمہ البعض بل حصول ان ینسب الذھن الثبوت او الانتفاء الذی بین طرفی المولف الی ما فی نفس الامر بالمطابقۃ و معناہ نسبۃ الحکم الی الصدق اعنی صادق داشتن وگرویدن و بینہ بانہ ضد الکذب الذی معناہ النسبۃ الی الکذب اعنی کاذب داشتن ہرچند محقق رح کو اس تقریر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ تصدیق علم اور مقولہ کیف سے ہے۔ مگر اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ تصدیق کے وقت ذہن کا کوئی فعل جس پر ینسب الذھن الثبوت اور نسبۃ الحکم الی الصدق اور صادق داشتن اور انہ ضد الکذب الذی

معناہ النسبۃ الی الکذب اعنی کاذب دختن دلالت کرتے ہیں یہ امر قابل تسلیم ہے کہ زید قائم کی صورت ترکیبیہ گو ذہن میں موجود ہے نفس زید اور قائم کی طرف اسطرح منسوب کرنا کہ وہ محکی عنہ کے مطابق ہے یا یوں کہئے کہ حکم کی نسبت صدق کیطرف کرنا نفس کا فعل ہے جیسے ہر شخص جانتا ہے کہ تکذیب نفس کا فعل ہے جس پر مقولہ کیف ہرگز صادق نہیں آسکتا یہ فعل اگر اذعان کفار میں ہے اور تصدیق منطقی کے لئے وہ کافی ہے تو ایمانی تصدیق کے لئے دوسرے فعل کی ضرورت ہے اور اگر نہیں ہے تو تصدیق سے اسکو خارج سمجھنا چاہیے اور چونکہ محقق موصوف نے اسکو تصدیق منطقی میں داخل کیا ہے تو معلوم ہوا کہ تصدیق منطقی اور ایمانی ایک نہیں ہیں حالانکہ شیخ کے کلام سے ثابت ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ ذکر الشیخ فی الشفا ان الشیٔ یعلم علی وجہین احدھما ان یتصور فقط کما اذا کان لہ اسم فینطق بہ مثل معناہ فی الذھن وان لم یکن ھناک صدق او کذب کما اذا قیل انسان او قیل افعل کذا فانک اذا وقفت علی معنی ما یخاطب بہ من ذالک کنت تصورتہ والثانی ان یکون مع التصور تصدیق کما اذا قیل لک مثلاً ان کل بیاض عرض لم یحصل من ھذا التصور معنی ھذا القول فقط بل صدقت انہ کذالک اما اذا شککت انہ کذالک فقد تصورت ما یقال لک فانک لا تشک فیما لا تتصورہ ولا تفھمہ ولکن لم تصدق بہ بعد فکل تصدیق یکون معہ تصور ولا ینعکس فالتصور فی مثل ھذا المعنی یفید لہ ان تحدث فی الذھن صورۃ ھذا التالیف وما یولف منہ کالبیاض والعرض والتصدیق وھو ان یحصل فی الذھن نسبۃ ھذہ

الصورۃ الی الاشیاء انفسھا انھا مطابقۃ لھا والتکذیب یخالف ذالک انتھی

دیکھئے شیخ کا یہ قول کہ "جب تم سے کل بیاض عرض کہا جائے تو اسکے معنی کا تمہیں صرف تصور ہی نہ ہوگا بلکہ اسکی تصدیق بھی کرو گے کہ وہ ایسا ہی ہے" صاف کہہ رہا ہے کہ تصدیق گویا کسی کے قول کی ہوا کرتی ہے۔ پھر اسکی تصدیق اس طور سے کہ وہ ایسا ہی ہے گویا نفس کا قول ہے جو اس کے خطاب کے جواب میں کہا جاتا ہے اور یہ محاورہ میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا اور میں نے اسکی تصدیق کی۔ شیخ بھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں اور نیز شیخ کا یہ قول کہ التکذیب یخالف ذالک ای التصدیق اسی پر قرینہ ہے اسلئے کہ اصطلاحی لفظ اگر ہے تو تصدیق ہے اسکو چاہیں کیف سے کہیں یا انفعال سے مگر تکذیب کی معنی میں کوئی اصطلاحی تصرف نہیں ہوا اسلئے اسکے معنی صرف جھٹلانے کے ہیں جو مقولہ فعل سے ہے۔ پھر جب شیخ نے تصدیق کو ضد تکذیب کہا تو اس سے مستفاد ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی مقولہ سے ہیں چنانچہ محقق موصوف نے اسی بحث میں لکھا ہے وھو معنی التصدیق نسبۃ الحکم الی الصدق اعنے صادق داشتن و گرویدن و دینہ بانہ ضد التکذیب الذی معناہ النسبۃ الی الکذب اعنی کاذب داشتن۔ دیکھئے صادق داشتن و کاذب داشتن ایک ہی قسم کی بات ہے غرض اس اعتبار سے تصدیق منطقی بعینہ تصدیق لغوی ہوئی یعنی دونوں مقولہ فعل سے ہوں گے چنانچہ محقق جرکو بھی اسکا اقرار ہے جیسا کہ شرح مقاصد میں لکھتے ہیں وھو القدوۃ فی فن المنطق والتقدۃ فی تفسیر الفاظہ وشرح معانیہ صرح بان التصدیق

المنطقی الذی قسم العلم الیه والی التصور هو بعینه اللغوی - اگرچہ
محقق اس بات پر راضی نہیں کہ تصدیق مقولہ فعل سے ہو لیکن شیخ نے تصدیق کو
جب مقابل تکذیب کہدیا اور اُسکو خطاب کی تصدیق قرار دی تو اُسکو مقولہ فعل سے
قرار دینا اور کلام نفس کہنا شیخ کے خلاف مرضی نہو گا

قصد السبیل میں لکھا ہے کہ اگر کہا جائے کہ شیخ کے قول سے ثابت ہوتا ہے
تصدیق علم ہے اس لئے کہ ذہن میں جو نسبت صورت ذہنیہ کی اشیاء کی طرف ہوتی
ہے وہ سوائے اس ادراک کے نہیں کہ وہ صورت مطابق اشیاء کے ہے - تو
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ادراک اذعان کو مستلزم نہیں اسلئے کہ شیخ الاسلام ابو عبداللہ
نے تحریر المطالب فی شرح عقیدۂ ابن حاجب میں قول ابی جہل کا نقل کیا کہ نعلم
ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم نبی ولکن لا نؤمن به ابدا - اس
سے ظاہر ہے کہ وہ ادراک مستلزم تصدیق بھی نہیں چہ جائے کہ نفس
تصدیق ہو - انتہی -

یہ جو کہا جاتا ہے کہ صورت ذہنیہ کی نسبت اشیاء کی طرف کرنا سوائے ادراک
کے اور کوئی بات نہیں چنانچہ محقق نے بھی اعتراضات مذکورہ کے ضمن میں اسی
قسم کی بات لکھی کہ تصدیق ایمانی سوائے ادراک کے اور کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی
سو فی الحقیقۃ درست ہے تصدیق کے وقت ذہن میں کیفیت ادراک کی ضرور ہوتی
ہے مگر اسکا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دوسرے مقولات کے مصادیق بھی وہاں
موجود ہیں چنانچہ قصد السبیل میں لکھا ہے کہ فانه ای الشیخ یفسر العلم
تارۃ بالتجرد عن المادۃ وھو راجع الی امر عدمی وتارۃ یجعله مندرجا

فی مقولة الکیف وفی مقولة المضاف بالعرض فیجعله عبارۃ عن صفة
ذات اضافة وتارۃ یجعله عبارۃ عن الصورۃ المرتسمة فی الجوھر
العاقل المطابقة لماھیة المعقول وتارۃ یجعله عن مجرد اضافة
فاقواله دائرۃ بین ان یجعله امرا عدمیا او کیفا او اضافة ان تصریحات
شیخ سے ظاہر ہے کہ سب امور ذہن میں موجود ہوتے ہیں - اس سے دوسرے
اقوال سے جو علم کے باب میں وارد ہیں یہ ثابت ہے کہ ادراک کے وقت کئی چیزیں
ذہن میں پائی جاتی ہیں چنانچہ منجملہ اُن کے ایک صفت کلام ہے جسکا حال مواقف
میں بیان کیا ہے - الکلام النفسی غیر العلم اذ قد یخبر الرجل عما لا
یعلمه بل یعلم خلافه او یشك فیه وغیر الارادۃ اذ قد یامر بما لا یریده
کالمختبر لعبدہ ھل یطیعه ام لا وکالمعتذر من ضرب عبدہ
لعصیانه فانه قد یامرہ ویرید ان لا یفعل الماموربه فاذن ھو
صفة ثالثة قائمة بالنفس - اس سے ثابت ہے کہ کلام نفسی ایک جداگانہ
صفت ہے اور چونکہ کسی کی تکذیب یا تصدیق کرنا نفس کا فعل ہے اس لئے ہم
کہہ سکتے ہیں کہ وہ نفس کی صفت اور فعل ہے جیسے بعض علماء کا قول جو شرح
مقاصد میں منقول ہے اُسکا مصدق ہے امام موفق رح نے مناقب ابی حنیفہ رح میں
بسند متصل امام صاحب سے روایت کیا ہے قال ابو حنیفة رح فامن
صدق اللہ وبما جاء من عندہ بقلبه ولسانه فھو عند اللہ و
عند الناس مومن یعنے امام صاحب فرماتے ہیں کہ جس نے دل سے اور
زبان سے تصدیق کی اللہ کی اور اُن چیزوں کی جو اُس کے پاس سے آئی ہیں

وہ اللہ کے پاس بھی مومن اور لوگوں کے پاس بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس کلام کی تصدیق زبان سے ہو دل سے بھی ہونی چاہیئے کہ وہ سچ اور مطابق واقع کے ہے۔ علامہ ابن ہمام رح نے مسامرہ میں لکھا ہے کہ لا ظھر ان التصدیق قول للنفس الناشی عن المعرفۃ لان المفھوم منہ لغۃ نسبۃ الصدق الی القائل وھو فعل والمعرفۃ من قبیل الکیف المقابل لمقولۃ الفعل۔

بہرحال تصدیق شرعی میں فعل قلبی معتبر ہے۔ قصد السبیل میں اس مسئلہ میں ایک مبسوط بحث کر کے لکھا ہے کہ تصدیق شرعی میں دس چیزیں ہوتی ہیں پانچ مقولہ کیف سے ہیں اور باقی مختلف مقولوں سے۔ مقولہ کیف والے یہ ہیں۔

(۱) نور جو دل میں اس غرض سے ڈالا جاتا ہے کہ چشم بصیرت پر حقایق اشیاء منکشف ہوں۔

(۲) صورت اُس نسبت معلومہ کی جو موضوع و محمول کے بیچ میں ہوتی ہے۔

(۳) استعداد اُس نسبت کے اذعان کی۔

(۴) نفس اذعان۔

(۵) کلام نفسی۔

مقولہ نسبت سے متعلق یہ تین ہیں

(۱) حصول صورت معلومہ کا نفس میں۔

(۲) انبساط نور کا صورت معلومہ پر۔

(۳) رویت بصیرت اُس صورت کی وجہ سے جب انبساط نور کا اُس پر ہوتا ہے اور یہی علم ہے۔

اور مقولہ انفعال سے ایک ہے وہ منتقش ہونا اُس صورت کا جو مبدا فیاض سے ڈالی جاتی ہے۔

اور مقولہ فعل سے ایک ہے وہ نفس کا یہ کہنا کہ جو صورت اُس میں منتقش ہوئی ہے وہ مطابق واقع کے ہے۔ اور یہی تصدیق لغوی ہے۔ جسکو حکم بھی کہتے ہیں۔ اور باقی امور ضروریات و لوازم ہیں۔

اگرچہ اُن امور میں تقدم و تاخر ہے۔ مگر ذاتی ہے اسلیئے کہ جو زمانہ انتقاش صورت کا ہے وہی اُسکے حصول اور انبساط نور اور رویت بصیرت کا ہے۔

اِس تقریر میں نور کی جو زیادتی کی گئی ہے اُسکا منشاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔ انتہیٰ

توضیح اِس مضمون کی یہ ہے کہ جملہ خبریہ جو جنکی دین میں تصدیق کی ضرورت ہے مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اسکی صورت ذہن میں منتقش ہوتی ہے جس کی تعبیر موضوع و محمول و نسبت حکمیہ سے کیجاتی ہے پھر دلائل و قرائن خارجیہ مثلاً معجزات وغیرہ اسباب سے ادراک ہوتا ہے کہ وہ نسبت رسالت جو حضرت کی طرف کی گئی ہے واقعی مطابق واقع کے ہے اگر یہ ادراک اِس درجہ کا ہو کہ اُس میں کوئی تردد و شک باقی نہو اُسکا نام یقین ہے اِسکے پیدا ہونے کی یہ صورت ہے کہ ایک نور حسب قابلیت دل میں ڈالا جاتا ہے جسکی وجہ سے چشم بصیرت پر معانی ذہنیہ منکشف ہوتے ہیں

جیسا آیہ موصوفہ سے ثابت ہے۔ مگر قابلیت ہر شخص کی ایک طور پر نہیں چنانچہ یہ امر مشاہد ہے کہ ایک ہی دلیل ہوتی ہے جسکو ایک شخص فوراً قبول کر لیتا ہے اور دوسرے

کے لئے وہ بالکل مفید نہیں ہوتی - پھر اختلاف طبائع قطع نظر اسکے کہ طبیعت کی
ساخت جداگانہ ہوتی ہے اسباب خارجیہ سے بھی پیدا ہوتا ہے - مثلاً ایک شخص
ایسا ہو کہ نشوونما اُسکی اہل اسلام میں ہوئی ہو اور ہمیشہ اپنے بزرگوں اور معتمد علیہ لوگوں
کو طریقۂ اسلام پر قایم اور اُسکے مداح دیکھا کیا اگر کوئی اُس سے دینی مسئلہ کہا جائے
تو فوراً مان لے گا بخلاف اِسکے جسکی نشوونما مخالفین اسلام میں ہوئی ہو - جو ہمیشہ
اُسکے ولایت وعقائد کی توہین کرتے ہوں - ظاہر ہے کہ جس مسئلہ کو شخص سابق
نے بغیر دلیل کے مان لیا تھا اِس شخص کو دلیل قایم ہونے کے بعد بھی ماننا مشکل ہوگا
اسی طرح مخالف صحبت کا بھی بُرا اثر ہوتا ہے اِسی وجہ سے حق تعالیٰ نے متعدد
مقامات میں کفار اور منافقوں کی صحبت اور دوستی سے منع فرمایا ہے - چنانچہ ارشاد
ہے - فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا فى حديث غيره انكم اذا
مثلهم - اور اکثر احادیث سے ثابت ہے کہ اہل بدعت کی مصاحبت وہم نشینی
سے احتراز ضروری ہے - غرض کہ جسطرح کسی مسئلہ کو ابتدا ئً ماننا دشوار ہے اسی طرح
اُنکی صحبت سے مانے ہوئے مسائل میں بھی شک پڑ جاتا ہے جس سے یقین
باقی نہیں رہتا اور یقین کے ساتھ ایمان اور تصدیق شرعی بھی رخصت ہو جاتے ہیں
نعوذ باللہ من ذلك -

کلام اس میں تھا کہ ادراک مذکور اگر اس درجہ کا ہو کہ اُسمیں کوئی تردد و شک
نہو تو اُسکا نام یقین ہے جو مدار ایمان و تصدیق شرعی ہے - اور اگر ایسا یقین نہو
بلکہ ظن غالب اُسکی واقعیت کا ہو تو شرعاً اُسکو نہ تصدیق کہیں گے نہ ایمان -
قال اللہ تعالیٰ ان الظن لا يغنى من الحق شيئا وقال تعالیٰ الا من اكره و

قلبه مطمئن بالايمان - اگر اکراہ کی حالت میں کوئی کفر کی بات کہدے
تو مضائقہ نہیں بشرطیکہ دل مطمئن اور ساکن ہو کیونکہ اطمینان سکون کو کہتے ہیں -
کما فی لسان العرب الطمانينة السكون - اور ظاہر ہے کہ سکون اُسی وقت ہوگا
کہ یقین باقی رہے اسلئے کہ شک میں تردد اور پریشانی رہتی ہے جو منافی سکون ہے
پھر یقین کے بعد اذعان کی بھی ضرورت ہے وہ ایک کیفیت قلبی کا نام ہے
جس سے نسبت خبریہ کے قبول کرنے کی صلاحیت دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو
صعوبت کہ اُس کے قبول کرنے میں ہو دفع ہو جاتی ہے - اِس آیۂ شریفہ میں اسی
طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے ثم تلين جلودهم الى ذكر الله کیونکہ تسلیم
و اذعان کے وقت جو دل میں کیفیت پیدا ہوتی ہے اگر محسوسات میں دکھلانا چاہیں
تو اُسکو نرمی پانے کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں - پھر قوت دلائل و قرائن کی وجہ سے
اگر کیفیت اذعانی بھی پیدا ہو جائے تو جب بھی تصدیقِ شرعی نہیں جیسا کہ اس
آیۂ شریفہ سے ظاہر ہے - فلما جاءتهم اياتنا مبصرة قالوا هذا سحر
مبين وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا یعنی باوجودیکہ
نشانیاں دیکھتے ہیں اور اُنکے نفس یقین بھی کر لیتے ہیں مگر وہ جحود و انکار ہی کئے
جاتے ہیں اِس سے معلوم ہوا کہ صرف یقین شرعی نہیں بلکہ تصدیق شرعی
یہ ہے کہ یقین کے بعد زبان سے اور دل سے یہ بھی کہا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
واقع میں اللہ کے رسول ہیں اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ہمیں پہونچا ہے واقع
میں سچ ہے

معرفت - معرفت ضد نکارت وجہالت ہے اور جب تک تصدیق نہو

فقط معرفت سے ایمان متحقق نہیں ہو سکتا۔ ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں امام اعظمؒ کا قول کتاب وصیت سے نقل کیا ہے کہ صرف معرفت ایمان نہیں ہے۔ ورنہ تمام اہل کتاب کو مومن کہنا پڑے گا حق تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے و اللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون۔ اور اہل کتاب کے باب میں فرماتا ہے الذین اتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ باوجود اتنی معرفت کے وہ ایمان نہیں لاتے اس سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب کی معرفت بھی ایسی ہے جیسے منافقوں کا اقرار زبانی یعنی دونوں مفید نہیں۔

درمنثور میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ عمرؓ نے عبداللہ ابن سلام سے پوچھا کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی پر آیۂ شریفہ الذین اتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔ نازل فرمائی یہ معرفت کس قسم کی ہے انہوں نے کہا اے عمرؓ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی ایسا پہچان لیا جیسے کوئی اپنے لڑکے کو دوسرے لڑکوں میں دیکھ کر بلا تکلف پہچان لیتا ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ عمرؓ نے کہا یہ کسطرح۔ کہا کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں حق تعالیٰ نے اُن کا حال ہماری کتاب یعنی توریت میں بیان فرما دیا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ عورتیں کیا کرتی ہیں۔ یعنی لڑکے میں شک ہو سکتا ہے کہ اپنا ہے یا نہیں مگر بعد تعریف الٰہی حضرت کی نبوت میں ہرگز شک نہیں ہو سکتا انتہی۔ اور اسی قسم کی کئی روایتیں دوسرے اہل کتاب سے اُسی میں منقول ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور ایمان لائے۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس مقام میں یہ اعتراض لکھا ہے کہ اگر توریت و انجیل میں حضرت کے تفصیلی حالات و علامات موجود تھے کہ فلاں وقت اور فلاں مقام اور فلاں قبیلہ میں حضرت مبعوث ہوں گے اور آپکے شخصی علامات بھی اُن میں مذکور ہیں تو چاہیے تھا کہ مشرق سے مغرب تک کے اہل کتاب ایمان لاتے اور بعد اسقدر تفصیلی معرفت کے ممکن نہیں کہ کوئی انکار کر سکتا۔ اور اسقدر تفصیل ان کتابوں میں نہیں ہے تو ایسے وقت جس پر کما یعرفون ابناءھم صادق آئے خارج از قیاس ہے۔ اسکا جواب یہ دیا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ کتابوں کی وجہ سے انہیں یہ معرفت حاصل ہوئی تھی بلکہ دعوی نبوت کیساتھ معجزات نے برہان کا کام دیا تھا اور قاعدہ ہے کہ برہان مفید یقین ہوا کرتی ہے اس لئے انکو معرفت تامہ الٰہی حاصل ہوگئی تھی جیسے اولاد کی ہوتی ہے ہرچند امامؒ نے جو جواب کہ دیا ہے عقلی طور سے نہایت قوی ہے اور اسکی تائید ابوجہل کے قول سے بھی ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ نعلم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم نبی لکن لا نؤمن بہ مگر اسکا بھی انکار ہو نہیں سکتا کہ اہل کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علامات و آثار کا علم نسلاً بعد نسل چلا آتا تھا اور اُسکی تطبیق کرکے وہ حسب ہدایت ازلی اکثر ایمان لاتے تھے چنانچہ خصائص کبریٰ میں امام سیوطیؒ نے ان روایات کو کئی اوراق بلکہ اجزا میں ذکر کیا ہے اُن میں وہ علامات جنکی خبریں حضرت ابراہیم و موسیٰؑ و عیسیٰ علیہم السلام نے دی تھیں اور توریت و انجیل وغیرہ کتب آسمانی میں مذکور ہیں مفصل منقول ہیں۔ اور نیز اُن روایات میں بھی مصرح ہے کہ یہودی و نصاریٰ کے علماء

حضرت کا حلیہ حتیٰ کہ قد و قامت اور خط و خال اور عادات و خصال اور پیدا ہونے کا مقام اور مبعوث ہونے کا وقت اور ہجرت کا زمانہ وغیرہ پوری طور سے جانتے تھے چنانچہ جس روز حضرت پیدا ہوئے اسی صبح کو مدینہ طیبہ کے گرد و نواح کے بعض علمائے یہود نے اپنی قوم کو جمع کر کے خبر دی کہ آج نبی آخر الزماں پیدا ہو گئے - ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے اسی روز گرے فارس کے آتشکدے جو مدتوں سے سلگے ہوئے تھے یکبارگی بجھ گئے ولادت شریف اور بعثت کے وقت کاہنوں اور ہاتفوں کے اخبار ہر طرف مشہور ہو رہے تھے بعض عرب دین حق کی تلاش میں جو پھرتے تھے انکو علمائے یہود و نصاریٰ نے صاف کہدیا کہ تمہاری قوم میں مکہ معظمہ میں نبی آخر الزمان عنقریب مبعوث ہونیوالے ہیں اُنکا دین اختیار کرو۔

بخت نصر کے واقعہ کے بعد بہت سے بنی اسرائیل مدینہ طیبہ میں حضرت کے انتظار میں اقامت گزیں تھے چونکہ خصائص کبریٰ چھپ گئی ہے اسلئے بخوف تطویل وہ روایتیں نقل نہیں کی گئیں۔

غرضکہ علامات حضرت کے اس قدر کثرت سے مشہور اور معلوم ہو چکے تھے کہ علمائے یہود و نصاریٰ دیکھتے ہی حضرت کو پہچان لیتے اور جن امور میں امتحان کی ضرورت ہوتی بعد امتحان ایمان لاتے پھر صرف حضرت ہی کے علامات یہود میں شایع نہ تھے بلکہ حضرت کی امت کے علامات و خصوصیات اور بعض مختصہ مسائل اسلام کو بھی جانتے تھے یہاں تک مروی ہے کہ قبل بعثت صدیق اکبرؓ شام کی طرف گئے تھے ایک راہب نے علامات ظاہری دیکھکر آپ سے کہا کہ سب علامات تو میں دیکھ چکا ہوں آپ اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایئے چنانچہ خال دیکھ کر کہا کہ نبی آخر الزمان عنقریب مبعوث

ہونے والے ہیں آپ اُنکے وزیر و خلیفہ ہوں گے - اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ کا بھی واقعہ ہے کہ بعض راہبوں نے علامات دیکھ کر اسی قسم کی خبریں دیں غرض اس قسم کی روایتیں کتب احادیث و سیر میں بکثرت وارد ہیں - اتنے علامات مشہور ہونے کے بعد یہ امر قابل استبعاد نہیں کہ اہل کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اُنکے علوم سابقہ سے ہوئی ہو جس پر معجزات نے بھی نور علیٰ نور کا کام دیا اس سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب کی معرفت اُنکے ذاتی علوم سے تھی اُس میں معجزات کو چنداں دخل نہیں ورنہ اہل کتاب کی کیا خصوصیت معجزات تو مشرکین بھی دیکھتے تھے - رہا یہ کہ پھر سب اہل کتاب مسلمان کیوں نہیں ہوئے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی تو مسلمان نہیں ہوئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ علامات مختصہ مفید علم نہوں بلکہ ایمان نہ لانا حسد و استکبار وغیرہ اسباب سے تھا جسکا حال اوپر معلوم ہوا اور ابوجہل کے قول مذکور سے بھی ثابت ہے بہر حال خواہ معجزات کی وجہ سے ہو یا کتب سماوی کی وجہ سے اہل کتاب کو بلکہ دوسرے کفار کو بھی حضرت کی معرفت اور نبوت کا علم ضرور تھا لیکن تصدیق ہونے کی وجہ سے بجائے اسکے کہ وہ مفید ہو وبال جان ہوئی مقصود یہ ہے کہ صرف معرفت بغیر تصدیق کے مفید نہیں ہو سکتی - اب یہ دیکھنا چاہیے کہ تصدیق شرعی کے ساتھ معرفت کی بھی ضرورت ہے یا نہیں ہم جب معرفت کے معنی میں غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق بغیر معرفت کے نہیں ہو سکتی اسلئے کہ خدائے تعالیٰ کو مثلاً کوئی نجانے یا صرف اسقدر جانے کہ کوئی چیز ہے اور صفات مختصہ کو جس سے امتیاز و تعین حاصل ہو نہ جانے تو تصدیق ہی کیا ہوئی ہاں اس میں شک نہیں کہ حق تعالیٰ کی

ذات کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی مگر صفات کی معرفت بقدر طاقتِ بشری ضروری ہے کچھ نہیں تو اتنا تو جاننا ضرور ہے کہ وہ قدیم ہے سب کا خالق ہے اور اسکے مثل کوئی چیز نہیں۔ نہ اُسکا کوئی شریک ہے نہ مقابل اِسلئے بن دیکھے ایمان لا رہے ہیں اِسکی تعیین ہوجائے تاکہ دوسرا کوئی اُس ایمان میں شریک نہو۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعیین بھی ایمان میں ضرور ہے۔

علامہ زرقانی نے شرح مواہب اللدنیہ میں لکھا ہے روی ابن ابی عاصم فی السنۃ وابو نعیم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہُ۔ ان اللہ قال یاموسیٰ من لقینی وھو جاھل بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم ادخلہ النار فقال موسیٰ ومن محمد قال یاموسیٰ وعزتی وجلالی ماخلقت خلقا اکرم علی منہ کتبت اسمہ مع اسمی علی العرش قبل ان اخلق السموات والشمس والقمر بالفی الف سنہ انتھیٰ

یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰؑ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے موسیٰؑ جو مجھسے ملے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جانے اُسکو آگ میں ڈالوں گا موسیٰؑ علیہ السلام نے عرض کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ فرمایا قسم ہے میری عزت وجلال کی اِن سے بزرگ تر کسی کو میں نے نہیں پیدا کیا اُنکا نام اپنے نام کے ساتھ بیس لاکھ برس آسمان و زمین وشمس وقمر پیدا کرنے کے پیشتر لکھا انتھیٰ۔

اِس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاہل رہنا موجب دخول نار ہے اِسلئے اُسکی ضد یعنی معرفت ضروری ہے۔ اِسی وجہ سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ الایمان المعرفت والتصدیق والاقرار

(کذا فی المناقب للموفق رح) ابن ہمام رحؒ نے مسامرہ میں لکھا ہے کہ امام ابو الحسن اشعری رحؒ کا قول معنی تصدیق میں متردد ہے کبھی کہتے ہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کے وجود والہیۃ وقدم کی معرفت کا نام ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ نفس کا قول ہے لیکن متضمن معرفت ہے کہ جسکے بغیر تصدیق صحیح نہیں غرض اُنکے کلام میں دو احتمال ہیں ایک معرفت کا شرط تصدیق ہونا دوسرا یہ کہ تصدیق معرفت اور کلام نفسی کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معرفت تصدیق سے خارج اور اُسکے لئے شرط ہے اسلئے کہ لغت میں تصدیق صرف سچائی کو کہتے ہیں اگر معرفت بھی اسمیں داخل کر دیجائے تو اِس لفظ کا منقول شرعی ہونا لازم آئیگا حالانکہ منقول سمجھنے کے لئے کوئی دلیل چاہیئے اور کوئی دلیل اُس پر قائم نہیں بلکہ قرآن وحدیث میں جہاں یہ لفظ مستعمل ہے معنی لغوی ہی میں مستعمل ہے الحاصل معرفت گو داخل ایمان نہیں مگر شرط ایمان ضرور ہے انتھیٰ یہاں یہ بات بھی معلوم کرنی ضرور ہے کہ معرفت کے مدارج مختلف ہیں عموماً اہل اسلام اجمالاً اسقدر جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ خالق اور متصف بہ صفات کمالیہ ہے پھر جسقدر آثار قدرت وغیرہ صفات کمالیہ میں غور وتامل کیا جائے اسیقدر معرفت کی زیادتی ہوتی ہے اور جسقدر معرفت کی زیادتی ہو محبت زائد ہوتی ہے جو باعث ترقی مدارج قرب ہے۔

امام غزالی رحؒ نے احیاء میں توضیح کے لئے یہ مثال لکھی ہے کہ مثلاً امام شافعی رحؒ کی محبت کل شافعیوں کو ہے اور سب اُن کو عالم جانتے ہیں لیکن فقہائے شافعیہ کو ہر مسئلہ کے دقائق استدلال معلوم کرنے کے بعد جو قدر ومحبت امام کی ہوتی ہے وہ عامی شخص کو نہیں ہوسکتی اسی طرح جب کوئی کسی مصنف کی عمدہ

تصنیف یا کسی شاعر کا بلیغ قصیدہ دیکھتا ہے تو اُس سے ایک قسم کی محبت ہوتی ہے پھر اور بھی اُسکی عمدہ تصانیف و قصائد دیکھے اور غور و تامل سے اُسکی جلالت و شان معلوم کرے تو اُسکو جو محبت اور قدر اُسکی ہوگی وہ اس شخص کو نہیں ہوسکتی جو اُسکو صرف ایک عالم یا شاعر جانتا ہے غرض آدمی جسقدر مصنوعات الٰہی میں زیادہ تر غور و فکر کرے اور خدائے تعالیٰ کی جو جو نعمتیں اور احسانات تمام عالم پر خصوصاً اپنے پر ہو رہے ہیں اُنکو سوچے تو محبت زیادہ ہوگی اسی سبب سے صفات الٰہی میں غور و فکر کرنے کے فضائل احادیث میں بکثرت وارد ہیں منشا اُسکا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر معرفت زیادہ ہوگی اُسیقدر محبت زیادہ ہوگی چونکہ خدا اور رسول کی محبت کا زیادہ ہونا دین میں ایک ضروری امر ہے اور ظاہر ہے اُسکے حاصل کرنے کا ذریعہ معرفت ہے اسلئے اکابر اہل اسلام ہمیشہ زیادتی معرفت الٰہی کے طالب اور اُس میں مستغرق رہا کرتے ہیں۔ الحاصل بندہ کو خدا کی معرفت اور اسکے نبی کی معرفت حاصل کرنیکی ضرورت ہے۔

یہ امر قابل تسلیم ہے کہ معرفت ذات کو مقاصد دینیہ میں دخل کی یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات میں فکر کرنے کی ممانعت ہے جیساکہ حدیث شریف سے صراحتاً ثابت ہے اور دراصل ذاتِ الٰہیہ کا ادراک ممکن بھی نہیں اسلئے کہ خدائے تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن صفات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو دوسروں میں نہ پائی جائیں اور ظاہر ہے کہ جو صفات سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں پائے جاتے وہ ایسے ہی ہونگے جو ان میں غور و تامل کرنے سے عظمت و شان کبریائی دل میں متمکن ہوتی جائے گی پھر جس خاص صفت میں

اتنا غور و تامل کیا جائے کہ استغراق کی سی حالت پیدا ہو تو اُسکے مناسب دل کی کیفیت میں تغیر پیدا ہوا کرے گا مثلاً صفت قہاری کے مطالعہ کے وقت دل میں خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہوگی اور صفت جمال و رحمانیت کے مراقبہ سے محبت و عشق علیٰ ہذا القیاس ہر صفت کا جدا جدا اثر ہوگا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات مختصہ میں غور و فکر کرنے سے دل میں مختلف آثار پیدا ہوتے جائینگے اسی وجہ سے صحابہؓ کے حالات مختلف تھے جن کی طبیعتوں پر حضرتؐ کی عظمت کا پورا اثر تھا اُنہوں نے حضرتؐ کے چہرۂ مبارک کو آنکھ بھر کے کبھی نہیں دیکھا جیسا کہ شفا میں قاضی عیاض رح نے لکھا ہے کہ عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے کسی سے محبت نہ تھی مگر مجھسے کبھی نہو سکا کہ آنکھ بھر کے حضرتؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھوں اور اکثر روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ حضرتؐ کے روبرو ایسے سر جھکائے ہوئے بیٹھتے تھے کہ گویا اُن کے سروں پر پرند بیٹھے ہیں کہ ادنیٰ حرکت سے اُڑ جائینگے ہیں۔ اور ایک صحابی کا حال شفا میں لکھا ہے کہ جب تک وہ حضرتؐ کی مجلس میں حاضر رہتے چہرۂ مبارک ہی کو دیکھتے رہتے حضرتؐ نے اُسکی وجہ دریافت کی عرض کی میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں دیدار فائض الانوار سے متمتع اور بہرہ یاب رہتا ہوں شفا میں لکھا ہے کہ حضرتؐ جب وضو فرماتے یا تھوکتے یا ناک چھڑکتے تو صحابہ کا اُس پر ہجوم ہوتا اور ہاتھوں ہاتھ آب دہان و بینی وغیرہ کو لیکر اپنے منہ اور جسم پر ملتے اور اگر کوئی موئے مبارک ملجاتا تو فوراً اُٹھا کر تبرک بناتے تھے مخالفین یہ دیکھ کر یہ کہتے کہ ہمنے بڑے بڑے سلاطین مثل قیصر و کسریٰ دیکھے ہیں مگر کسی بادشاہ کو یہ

نصیب نہیں جو حضرت کو ہے خصائص کبریٰ میں ہے کہ ایک بار عبد اللہ بن
زبیرؓ حضرت کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوئے کہ حضرت پچھنے لگوا رہے تھے
فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ خون ایسی جگہ پھینک دو جہاں کوئی نہ دیکھے
انہوں نے لیجاکر سب خون پی لیا جب واپس آئے تو حضرت کے استفسار پر انہوں
نے عرض کی کہ میں نے اسکو ایسی جگہ ڈالا ہے کہ کوئی نہ دیکھ سکے فرمایا کہ شاید تم
اسکو پی گئے اور اسی میں یہ روایت بھی ہے کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے کسی ظرف میں پیشاب کیا ام ایمنؓ کہتی ہیں کہ میں نے اسکو پی لیا جب
صبح حضرت کو اسکی خبر دی تبسم کرکے فرمایا کہ تمہارے پیٹ میں اب کبھی کوئی شکایت
نہو گی ان امور پر غور کرنے سے ایک حیرانی ہوتی ہے کہ نہ انکا منشا محبت معلوم ہوتا
ہے نہ عظمت ورنہ مقربین سلاطین میں اس قسم کے حالات پائے جاتے۔ بات
یہ ہے کہ کاملوں کے حالات ہم ناقصوں کی سمجھ میں کیونکر آسکیں اگر حق تعالےٰ اپنے
کرم وفضل سے ہمیں بھی وہ حالات عطا فرمائے تو ممکن ہے کہ اسکی حقیقت
معلوم کر سکیں ورنہ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

دراصل یہ جتنے آثار تھے سب کا منشا وہی معرفت ہوئی تھی کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصیات کو خوب جانتے تھے کہ آپ کا کوئی نظیر عالم
میں نہیں اور آپ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے
کو نہیں ہو سکتی وہ سمجھتے تھے کہ جسقدر محبت اور عظمت کے آثار صادر ہوں سب
باعث تقرب آنکی ہیں بلکہ حضرت کی محبت اور تعظیم کو خدائے تعالیٰ کی محبت

اور تعظیم سمجھتے تھے ہر چند اس وقت صحابہ کی سی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں
اسلئے کہ انکو مشاہدات سے وہ معرفت حاصل ہوئی تھی جنکا وجود اب ممکن نہیں مگر
اتنا مسلمانوں کو ضرور ہے کہ ایمانی طریقہ سے حضرت کی معرفت حاصل کرنے میں
کوشش کریں اور کیا تعجب کہ شدہ شدہ اس کی برکت سے اس قسم کا فیضان ہونے
لگے جو صحابہ پر ہوتا تھا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　بسا کیں دولت از گفتار خیزد

خدا اور رسول کی محبت

اس حدیث شریف سے ظاہر ہے جو بخاری شریف میں ہے کہ ایک بار
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے تھے عمرؓ نے کمال
جوش محبت میں عرض کی یا رسول اللہ قسم خدا کی میں آپ کو سوائے اپنی ذات
کے ہر چیز سے زیادہ دوست رکھتا ہوں ارشاد ہوا کہ جب تک میری محبت اپنی
ذات سے کسی کو زیادہ نہو اسکو ایمان ہی نہیں عمرؓ نے عرض کی کہ قسم ہے خدا کی
جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہیں آپ کو اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب
رکھتا ہوں فرمایا الآن یا عمرؓ یعنی اب تمہارا ایمان پورا ہوا۔ اگرچہ اس
حدیث شریف میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ذکر ہے مگر چونکہ
حضرت کی محبت کا منشا حق تعالیٰ کی محبت ہے اس لئے یہی حدیث دونوں

محبتوں کے استدلال میں کافی ہوسکتی ہے۔

ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں بعض حقوق خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرکے لکھا ہے وفی ہذا وغیرہ بیان لتلازم الحقین وان اللہ جہۃ اللہ تعالیٰ ورسولہ جہۃ واحدۃ غرض اس حدیث شریف سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام حضرتؐ کی محبت بڑھانے پر مامور و مجبور ہیں کیونکہ عمرؓ نے ابتدا میں جس مقدار محبت کی خبر دی تھی وہ کافی نہیں سمجھی گئی اسلئے انہوں اختیار سے اپنے نفس پر جبر کرکے جو کسر باقی تھی نکالدی۔

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ محبت ایک کیفیت قلبی ہے اُس پر زیادتی و کمی اختیار سے کیونکر ہوسکتی ہے کیونکہ اندرونی کیفیات پر تو آدمی کا تصرف ہی نہیں چل سکتا مثلاً بھوکا اگر چاہے کہ بغیر سبب خارجی کے بھوک جاتی رہے تو ممکن نہیں اور صرف زیادتی و کمی کی خواہش کرنے یا طبیعت پر جبر کرنے سے موجودہ بھوک کے وجدان میں فرق نہ آئے گا جب تک اُس کے کم یا زیادہ ہونے کے اسباب خارج، سے نہ پیدا کئے جائیں مثلاً کچھ کھا لینے سے کم اور نہ کھانے سے زیادہ ہوجائیگی۔

مواہب لدنیہ میں علامہ قسطلانی نے خطابی کا قول نقل کیا ہے کہ یہاں مقصود حب اختیاری ہے حب طبعی نہیں جو اختیار سے خارج ہے۔ علامہ زرقانیؒ نے اُسکی شرح میں لکھا ہے کہ حب اختیاری مقتضائے عقل ہوتی ہے گو خلاف طبع ہو جیسے بیمار دوا کو دوست رکھتا ہے اگرچہ کڑوی اور مخالف طبع ہو۔ اور مواہب میں امام نوویؒ کا قول نقل کیا ہے کہ مقصود یہاں یہ ہے کہ نفس مطمئنہ کو نفس امارہ پر

غالب کردیا جائے جس سے حضرتؐ کی محبت تمام اشیا سے بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ ہوجائے گی اور نفس امارہ کا غلبہ ہو تو یہ ممکن نہیں اور اسی میں لکھا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے ایمان میں محبت شرط ہونیکی یہ وجہ لکھی ہے کہ محبت لازمہ عظمت ہے یعنی جس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ہوگی اُسکو محبت بھی ہوگی اور محبت نہ ہونے سے سمجھا جائے گا کہ اسکے دل میں عظمت نہیں اور نبیؐ کی عظمت دل میں نہ ہونا کفر ہے۔ مگر اُس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اعتقاد عظمت کو محبت لازم نہیں عمرؓ کے دل میں جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت تھی ظاہر ہے باوجود اسکے انہوں نے ابتدا میں اپنی ذات کی محبت پر حضرتؐ کی محبت کو فوقیت نہیں دی۔

اور لکھا ہے کہ عمرؓ نے پہلی بار حب طبعی کی خبر دی تھی جو اپنے نفس کے ساتھ تھی اور حضرتؐ کا مقصود یہ تھا کہ حب اختیاری کی ضرورت ہے چنانچہ انہوںؓ نے ایسا ہی کیا کہ دلائل اپنے دل میں قائم کرکے فوراً ترجیح محبت کی خبر دی۔ انتہیٰ

اسمیں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ایمان سے بڑا ہی تعلق ہے اس لئے کہ بہت سے آیات و احادیث ایسے ہیں کہ اُن پر کامل ایمان ہو تو محبت کی زیادتی ضرور ہوگی مثلاً آیہ شریفہ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین اگر آدمی اسی میں غور کرے اور اسکو یقین ہوجائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن رحمت الٰہی ہیں تو اُسکو ضرور آپ سے دلی محبت ہوگی کیونکہ یہ امر آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ جب کسی ذی رتبہ شخص کا حال سنتا ہے کہ وہ رحمدل ہے اور اُس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے تو اِس سے دلی محبت

پیدا ہوتی ہے اور جوں جوں اُسکے رحم اور فائدہ رسانی کے واقعات سنتا ہے محبت
میں ترقی ہوتی ہے اِسی کو دیکھ لیجئے کہ حاتم طائی کے واقعات سننے سے وجدانی
طور پر دل میں اُس سے محبت محسوس ہوتی ہے بخلاف اُسکے حجاج اور چنگیز خاں
سے دشمنی کی کیفیت پائی جاتی ہے حالانکہ اِس وقت نہ حاتم سے نفع کی توقع ہے
نہ اُن سے ضرر کا اندیشہ۔ بخلاف اِسکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود
باجود سے تو بے انتہا فوائد ہمیں حاصل ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں اور آئندہ
کے لئے بے شمار منافع کی امیدیں ہیں کیونکہ حضرت کا رحمۃ للعالمین ہونا اسوقت
تک محدود نہ تھا کہ آپ اِس عالم میں تشریف رکھتے تھے بلکہ قیامت کے روز
اُس رحمت عامہ کا ایسے طور پر ظہور ہوگا کہ تمام عالم اُسکو مشاہدہ کرلے گا۔ اگر
عالمین میں کفار بھی داخل ہیں مگر ہمیں اِس جگہ جھگڑے سے کیا کام کہ اُن کو
اُس رحمت عامہ سے حصہ ملے گا یا نہ ملے گا دشمنان خدا و رسول جہنم میں جائیں
ہمیں اپنی مشت خاک بخشوانے کی پڑی ہے اگر ہماری بخشش بطفیل محبت
رحمۃ للعالمین ہوگئی تو ہم جیسا کوئی خوش نصیب نہیں حق تعالیٰ نے آپ سے
وعدہ فرمایا ہے **ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ** اور فرماتے ہیں
یعنی البتہ قریب میں تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے
جس شخص کو قیامت کے روز اور اُس میں جو جو وقائع پیش آنے والے ہیں اُنپر
پورا ایمان ہو تو صرف اِسی ایک آیت اور حدیث پر ایمان لاکر دیکھ لے کہ حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان سے زیادہ ہوتی ہے یا نہیں مگر اِس کا
خیال رہے کہ ایمان وہ ہونا چاہئیے جسکا حال اوپر معلوم ہوا اگر اُن مضامین کا ذہول

ہوگیا ہو تو پھر ایک نظر اُس پر ڈال لیجائے تاکہ حقیقت ایمان پیش نظر اور متحقق
ہوجاوے صحیح صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ قیامت کے روز شان قہاری اور
غضب الٰہی کا ظہور ایک ایسی غیر معمولی طور پر ہوگا کہ اُسکے پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ بعد
ہوگا دیکھئے پہلے تو خدا کا غضب **الامان** اُسپر غضب بھی کیسا کہ ازل سے اسوقت
تک ویسا ہوا ہی نہیں۔ نہ نوح علیہ السلام کے وقت نہ اور کبھی اور نہ اُسکے بعد ہوگا حالانکہ
ابدالآباد غضب الٰہی میں رہیں گے مگر اُس غضب کے مقابلہ میں جو اُس روز ہوگا یہ غضب
بھی کم ہوگا اُس غضب کا تھوڑا سا حال اِس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انبیا علیہم السلام
جنکے مقربین بارگاہ الٰہی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں اُس روز نفسی نفسی کہیں گے
اور طرفہ یہ ہے کہ خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی باوجود خلت کے نفسی نفسی فرمادیں گے
اب نفسی نفسی کا مطلب کھلے لفظوں میں سن لیجئے کہ جب جن و انس انبیاء علیہم
السلام سے طالب شفاعت ہونگے تو وہ سب بالاتفاق یہ کہیں گے کہ اسوقت
غضب الٰہی کو وہ جوش ہے کہ شفاعت تو بڑی چیز ہے ہمیں اسوقت اپنی پڑی ہے
کہ نہیں معلوم کہ جو لغزشیں بمقتضائے بشریت ہم سے سرزد ہوئی تھیں اُن کا آج
کیا حشر ہوگا۔ اسوقت تمام عالم میں ایک سناٹا ہوگا نہ فرشتوں کی مجال کہ کچھ عرض و
معروض کرسکیں نہ انبیاء میں جرأت کہ دم مارسکیں پھر وہ دن بھی کتنا بڑا پچاس ہزار
سال کا جسکی خبر خدائے تعالیٰ دیتا ہے **تعرج الملئکۃ والروح فی یوم کان
مقدارہ خمسین الف سنۃ مما تعدون** اس روز عرض اعمال اور فیصلہ حقوق
ومحاسبہ وغیرہ پچاس کام ہونگے اور ہر کام ہوش ربا اور جاں گداز ہوگا حقوق اللہ
کی بازپرس اسطرح کہ عمر بھر کے کل حرکات و سکنات کا دفتر پیش ہے اور بات بات

کی پرسش ہو رہی ہے کہ خلاف خدا و رسول فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہ کیا اور فلاں جگہ کیوں بیٹھا اور فلاں شخص سے بات کیوں کی وغیرہ وغیرہ اگر بچاؤ کی غرض سے کسی بات کا انکار کیا تو ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضا گواہی دے رہے ہیں کہ یہ شخص جھوٹا ہے خود ہم سے اُس نے یہ کام لیا تھا کما قال اللہ تعالیٰ وتشہد علیہم السنتہم وایدیہم وارجلہم بما کانوا یعملون وقال تعالیٰ حتی اذا ما جاؤھا شہد علیہم سمعہم وابصارھم وجلودھم بما کانوا یعملون یعنی گواہی دیں گے اُن پر اُنکی زبانیں ہاتھ پاؤں کان آنکھیں اور اُنکے چمڑے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ اور حقوق الناس کی یہ کیفیت کہ ہر شخص اپنی نجات کی فکر میں لگا ہوا اِس دھن میں ہے کہ کسی طرح گناہوں کا بار سر سے ٹل کے اعمال حسنہ کا نصاب پورا ہو جاوے اس غرض سے ادنیٰ ادنیٰ حقوق کے مطالبہ کے لئے دوست قرابتدار ماں باپ جورو بچے دوڑے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے یہ یہ حقوق اسکے ذمہ ہیں دلا دئے جائیں اور اگر اُسکے پاس حسنات کا اسقدر سرمایہ نہیں تو ہمارے گناہ ہی اُسکے سر لگا دئے جائیں اور وہ بیچارہ اُن سے بھاگ رہا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ یہ لوگ وہ ہیں کہ عمر بھر اُنکے ساتھ احسان کرتے رہے اور اُنکے رنج و راحت میں شریک رہے اب یہی لوگ دوزخ میں پہونچانے کی فکر میں لگے ہیں اسی پر اُن ہچاسوں واقعوں کا قیاس کیجئے جو اُس روز وقوع میں آنے والے ہیں خلاصہ یہ کہ ہر ایک واقعہ جانکاہ و جانگداز ہو گا ادھر یہ پریشانی اُدھر جہنم پیش نظر ہے اور ھل من مزید کے نعرے بہ نعرہ لگا رہا ہے اب غور کیجئے کہ ایسی حالت میں کیا جان کوئی عزیز چیز سمجھی جا سکتی ہے ہرگز نہیں ایسی

زندگی سے تو مرجانا ہزار درجہ راحت ہی ہو گا اسی وجہ سے کفار آرزو کریں گے کہ کاش ہم مٹی ہوے ہوتے کما قال تعالیٰ ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا اب تمام واقعوں کو پیش نظر رکھکر غور کیجئے کہ ایسی حالت میں جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ الٰہی میں پیش ہو کر اپنی امت میں سے خصوصاً اُن لوگوں کی شفاعت فرماویں گے جنکو آپکے ساتھ محبت ہے اور باجازت کبریائی اُن تمام آفتوں سے نجات دلا کے جنت میں داخل فرماویں گے تو اب بتائے کہ وہ جان جو معرض تلف میں ہے جسکا نکلجانا بہتر سمجھا جاویگا وہ زیادہ تر محبوب ہونی چاہئے یا وہ حضرت جو اس جان کو ابدالآباد کے بے انتہا مصائب سے بچا کر ابدالآباد کے تلذذات میں پہونچانیوالے ہیں مگر یاد رہے کہ جان سے زیادہ محبت اُسی وقت ہو گی کہ ایمان امور مذکورہ بالا سے کامل طور پر ہو مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حدیث شریف سے یہ تھا کہ کمال ایمان کی شناخت تبلادیں کہ اگر جان سے زیادہ محبت ہو تو سمجھ جائیں کہ ایمان کامل ہے ورنہ اسکی تکمیل کی فکر کریں اُسپر بھی اگر کوئی حضرت سے محبت نہ رکھے تو حضرت کا اس سے کوئی نقصان نہیں اُس نے اپنا ہی نقصان کیا۔ اور دوسری وجہ ضرورت محبت کی یہ ہے کہ وہ آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے زیادہ محبت رکھتا ہے اُسکی بات مانتا ہے اور جس کام کے کرنے یا نکرنے کو وہ کہتا ہے اُسکی اطاعت کرتا ہے چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے ان المحب لمن یحب مطیع اسی وجہ سے ہر شخص کو اپنے سچے دوستوں پر وثوق اور اس بات کا افتخار رہتا ہے کہ ہم اپنے دوستوں سے جو کچھ کہیں گے کیسا ہی وہ مشکل کام ہو اُسکو وہ انجام دیں گے اور وجدانی طور پر دوست کی محبت کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اپنے

احباب میں کون سچے دلی قابل وثوق دوست ہیں اور کون ریائی اور غرضی۔ غرض کہ جس کے ساتھ کامل محبت ہوتی ہے اُسکی مخالفت کسی امر میں ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ مخالفت دشمنی کا لازمہ ہے۔ انتہائی درجہ کی محبت کسی سے ہو تو اُسکے کہے پر جان بھی دینا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ جسکو اپنی بی بی کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے تو اُسکے حکم کے مقابل میں اپنے ماں باپ کے حکم کی کچھ پروا نہیں کرتا بلکہ اُنکا دشمن ہو جاتا ہے حالانکہ اُنکے حقوق اور احسانات ایسے نہیں کہ اُنکا انکار کر سکے مگر اُس محبوبہ کی محبت کا یہ اثر ہے کہ وہ حقوق میں کان لم یکن ہیں ہر چند تقاضائے فطرت انسانی یہ تھا کہ والدین سے دشمنی یا مخالفت نہو سکی مگر محبوبہ کی محبت نے اُس کو آسان کر دیا۔ اب غور کیجئے کہ مومن کو کسی کیساتھ اگر اتنی محبت ہو کہ اُسکے حکم کے مقابلہ میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نہ مانے تو کیونکر کہا جائے کہ اُسکا ایمان کامل ہے اسی طرح اگر نفس کوئی حکم کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اُسکے خلاف میں ہو تو مومن کا فرض منصبی کیا ہونا چاہئے آیا نفس کا حکم مانے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تو کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا کہ نبیؐ کا حکم نہ مانیگا مگر جب اپنے نفس کی محبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے زیادہ ہوگی تو اکثر نفس ہی کی بات چل جائیگی جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اکثر ہوا کرے گی اس لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن کو ضرور ہے کہ اپنے ماں باپ اولاد اور تمام لوگوں سے بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ محبت میرے ساتھ رکھے تاکہ حضرت کے حکم کے مقابلہ میں کسی کا حکم نہ چلے کیونکہ یہ لوگ جس کام کا حکم کریں گے اُسمیں اُنکو اپنا نفع ذاتی ملحوظ ہوگا اسیطرح نفس بھی اُنہیں کاموں کی خواہش کرے گا جن میں صرف دنیوی تلذذات ہوں

بخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کو امر و نہی سے کوئی اپنا ذاتی نفع مقصود نہیں بلکہ جن کاموں کے کرنے کا آپؐ نے حکم فرمایا ہے اُن سے صرف ہماری بڑی بڑی منفعتیں دونوں جہاں کی متعلق اور وابستہ ہیں اور جن کاموں سے منع فرمایا دونوں جہاں میں وہ ہمارے مضر اور مہلک ہیں اس امر و نہی سے حضرتؐ کی غرض یہی ہے کہ ہمیں اُنکے بجا لانے سے ابد الآباد کی سعادت اور راحت نصیب ہو اور دارین میں کامیاب رہیں حق تعالیٰ فرماتا ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم یعنی آئے ہیں تم میں رسول تم میں کے شاق اور بھاری ہے اُن پر کہ تم ایذا میں پڑو تمہاری بھلائی پر وہ حریص ہیں ایمان والوں پر شفقت اور مہربانی رکھتے ہیں انتہی۔ حاصل یہ کہ جب کوئی ایسا کام پیش ہو کہ اُس میں اپنے نفس یا اور کسی محبوب کی خواہش ہو اور اُس کام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش اُسکے خلاف میں ہو تو مومن کو چاہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو پورا کرے اور اُنکی خواہش پر خاک ڈالے جو خود غرضی سے اپنے دوست کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری اطاعت اسوقت تک ممکن نہیں کہ اُن سب سے زیادہ محبت آپ کے ساتھ ہو اور جب تک امور مذکورہ پر کامل ایمان نہو گا اس قسم کی محبت حضرت سے ہو نہیں سکتی اس سے ظاہر ہے کہ حضرتؐ کی محبت کے ساتھ ایمان کو ایک تعلق خاص ہے غرض حضرتؐ نے جو خواہش فرمائی کہ تمام عالم سے زیادہ محبت آپکے ساتھ ہو اُسمیں بھی صرف ہماری بھلائی پیش نظر ہے اب ہمیں ضرور ہے کہ اگر اس قسم کی محبت اپنے میں پائیں تو شکر الٰہی بجا لائیں ورنہ دعا کریں کہ الٰہی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت عطا فرما کہ آپ کی اطاعت

ہم پر آسان ہو جائے اور اُسکے مقابلہ میں ہم سے نہ اپنے نفس کی اطاعت ہو سکے نہ اور کسی محبوب کی اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حال سنئے حق تعالیٰ فرماتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ یعنی کہدو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری اتباع کرو جس سے تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے۔ سبحان اللہ حضرت کی اطاعت کیسی باوقعت چیز ہے کہ محبوب الٰہی بنا دیتی ہے۔ دیکھئے یہاں بھی وہی بات ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ جسکے ساتھ آدمی محبت رکھتا ہے اُسکی اطاعت کرتا ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دعوے محبت رکھتے تھے گویا یہ فرمایا کہ اگر تمہیں ہم سے محبت ہے تو ضرور ہے کہ اُسکے آثار نمایاں ہونگے یعنی ہماری اطاعت کرو گے اور ہماری اطاعت یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ یعنی جسنے رسول کی اطاعت کی اُس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔

یہاں ایک اور بات معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ کو منظور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی مسلمانوں کو کامل محبت ہو کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ پوری اطاعت اُسوقت تک نہیں ہو سکتی کہ کامل طور پر محبت نہو اور حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں منحصر فرما دیا اِس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے ان آیات میں اُن لوگوں کو جو محبت الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں اشارۃً یہ حکم فرمایا کہ جسطرح ہمارے ساتھ محبت رکھتے ہو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پوری محبت رکھو جسکے آثار نمایاں ہوں یعنی اُنکی پوری اطاعت کرو اور اگر اطاعت نکی تو ہماری محبت کے دعوے میں

جھوٹے سمجھے جائیں گے۔

غرضکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دین میں ضروری سمجھی گئی ہے اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ سے کمال درجہ کی محبت تھی جیسا کہ شفا میں قاضی عیاض رح نے لکھا ہے۔ کہ کسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا کہ صحابہ کی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی تھی فرمایا ٹھنڈے پانی کے ساتھ جو کمال تشنگی کے وقت محبت ہوتی ہے۔ اِس سے بھی زیادہ تر تھی اس میں لکھا ہے کہ ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پاؤں سن ہو گیا۔ کسی نے کہا جسکے ساتھ آپ کو زیادہ محبت ہو اُسکو یاد کیجئے اچھا ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی یا محمدؐ کہکر چیخ ماری۔

مواہب لدنیہ میں روایت ہے کہ ایک روز ایک انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم آپکی محبت میرے دل میں اپنے جان و مال اہل و اولاد سے زیادہ ہے اگر میں حاضر خدمت ہو کر دیدار سے مشرف نہ ہوں تو یقین ہے کہ مر جاؤں گا۔ یہ کہکر رونے لگے حضرت نے رونے کی وجہ دریافت کی عرض کیا مجھے خیال آیا جب آپ انتقال فرمائیں گے اور میں بھی مر جاؤں گا تو آپ انبیا علیہم السلام کے ساتھ مقامات عالیہ میں تشریف فرما ہوں گے اور ہم اگر جنت میں گئے بھی تو نیچے کے درجہ میں رہیں گے پھر آپ کا دیدار کیونکر نصیب ہو گا یہ سُنکر حضرت خاموش ہو گئے اُسیوقت یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی ومن یطع اللہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقا۔ یعنی جو لوگ خدا و رسول کی اطاعت کرتے رہیں وہ انبیاء و صدیقین اور شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوں گے اور

اسمیں یہ روایت بھی ہے کہ جنگ احد کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مدینہ طیبہ میں مشہور ہوگئی یہ سنتے ہی گوشہ نشین عورتیں گھروں سے نکل پڑیں چنانچہ قبیلہ انصار کی ایک بی بی نے دیکھا کہ اپنے بھائی اور باپ اور شوہر کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مگر اس خبر وحشت اثر کی وجہ سے انہوں نے انکی کچھ پروا نکی اور ایک ایک سے پوچھتی تھیں کہ حضرتؐ کہاں ہیں جب انہوں نے حضرتؐ کو دیکھا تو بے اختیار دامن مبارک کو تھام کر کہنے لگیں یا رسول اللہ جب آپ سلامت ہیں تو مجھے اب کسی کے مرنیکی کچھ پروا نہیں۔ اور اسمیں یہ روایت ہے کہ ایک بی بی حضرت عائشہ کے پاس حاضر ہوکر کہنے لگیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مجھے دکھلائیے جب آپ نے دکھلایا تو دیکھتے ہی اُن کا حال یہ ہوا کہ روتے روتے بیہوش ہوگئیں اور انتقال کر گئیں۔

مواہب لدنیہ میں ایوب سختیانی کا حال لکھا ہے کہ جب مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوتا تو وہ اسقدر روتے کہ بیخود ہو جاتے۔ علامہ زرقانی رحؒ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ امام مالک رحؒ اپنے شاگردوں سے فرماتے تھے کہ جن محدثین سے میں روایت کرتا ہوں اُن سب میں ایوب افضل تھے میں نے اُنکے ساتھ دو حج کئے۔ پہلے حضرت انکو دیکھا کرتا کوئی روایت نہ لیتا اُنکی حالت یہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تو اسقدر روتے کہ مجھے اُن پر رحم آتا تھا۔ جب اُن کی یہ حالت دیکھی اور اسقدر عظمت اُن کے دل میں پائی اُن سے روایتیں لینا شروع کیا

مصعب ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحؒ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا جس سے حضار مجلس کے دلوں پر اثر پڑتا تھا کسی نے

اُن سے یہ حالت بیان کی فرمایا جو میں نے دیکھا ہے اگر تم دیکھتے تو اسکا انکار کرتے میں نے محمد بن منکدر کو دیکھا ہے کہ جب اُن سے کوئی حدیث پوچھی جاتی تو اسقدر روتے کہ پوچھنے والے کو رحم آجاتا۔

مواہب میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادقؒ باوجودیکہ نہایت خوش طبع تھے اور بہت ہنستے تھے مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آجاتا تو چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا۔ عبدالرحمٰن بن قاسم جو محمد بن ابی بکرؓ کے پوتے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنتے تو انکا رنگ ایسا ہو جاتا کہ گویا جسم سے خون نکل گیا۔ اور زبان خشک ہو جاتی تھی انتہیٰ۔

اِن روایات کے سوا اور بہت سی روایتیں کتب سیر وغیرہ میں مروی ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ اکابر دین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو محبت تھی خارج از بیان ہے یہی وجہ تھی کہ اتباع اور اطاعت اعلیٰ درجہ کی ان حضرات پر آسان ہوگئی تھی۔ اسی اتباع کی بدولت وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوگئے۔ حدیث شریف میں وارد ہے

ادبوا اولادکم علی خصال ثلاث علی حب نبیکم وحب اھل بیتہ وعلی قراءۃ القرآن الحدیث رواہ الدیلمی فی الفردوس عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یعنی اپنی اولاد کو تین چیزوں کی تعلیم کرو اپنے نبیؐ اور اُنکے اہل بیت کی محبت اور قرآن کا پڑھنا۔ ظاہر محبت کی تعلیم کی یہی صورت معلوم ہوتی ہے کہ حضرتؐ کے پورے پورے فضائل و کمالات ذاتی اور ہماری احتیاج آپکے ساتھ اور آپ کا ہر مصیبت میں ہماری دستگیری فرمانا وغیرہ امور لڑکوں کو تعلیم کئے جائیں جس سے اُن کی نشوونما حضرت

کی محبت کے ساتھ ہو اور قاعدہ ہے کہ اُسیوقت کی تعلیم کا اثر طبیعت میں راسخ ہوتا ہے
یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کی روش و آئین کو اختیار کرتا ہے۔ ابن تیمیہؒ نے
الصارم المسلول میں لکھا ہے الایمان وان کان اصله تصدیق القلب فذلک
التصدیق لابد ان یوجب حالاً فی القلب وعملاً له وهو تعظیم الرسول
واجلاله ومحبته وذلک امر لازم كالتالم والتنعم عند الاحساس
بالمولم المنعم یعنی اگرچہ کہ ایمان کا اصل تصدیق قلبی ہے مگر اُس کے ساتھ یہ بھی
ضرور ہے کہ دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور اجلال اور محبت پیدا ہو اور یہ امر لازمی
ہے جسطرح کوئی دکھ دینے والی چیز کے احساس سے درد اور لذت دار چیز کے احساس
سے لذت پیدا ہوتی ہے۔

وقال ایضا فیه ان الله سبحانه اوجب لنبينا صلى الله عليه وسلم
على القلب واللسان والجوارح حقوقا زائدة على مجرد التصديق بنبوته
كما اوجب سبحانه على خلقه من العبادات على القلب واللسان والجوارح
امورا زائدة على مجرد التصديق به سبحانه وحرم سبحانه لحرمة رسوله
ما يباح ان يفعل مع غيره امورا زائدة على مجرد التكذيب بنبوته ومن
حقه ان يكون احب الى المومن من نفسه وولده وجميع الخلق كما دل على
ذلك قوله سبحانه قل ان كان آباؤكم وابناؤكم واخوانكم وازواجكم
وعشيرتكم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن
ترضونها احب اليكم من الله ورسوله

یعنی ابن تیمیہؒ نے صارم مسلول میں یہ لکھا ہے کہ جس طرح خدا ئے تعالیٰ نے

علاوہ مجرد تصدیق کے اپنی عبادت لوگوں کے دلوں اور زبانوں اور جوارح پر مقرر
کی ہے اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق لوگوں کے دلوں اور زبانوں اور جوارح
پر مقرر کئے ہیں جو علاوہ تصدیق نبوت کے ہیں اور کئی امور ایسے جو دوسروں کے ساتھ
جائز ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کیوجہ سے وہ حرام کر دئے گئے جسطرح تکذیب
آپکی حرام ہے منجملہ ان حقوق کے ایک حق آپ کا یہ ہے کہ آپکی محبت اپنی جان اور
اولاد اور جمیع خلق سے زیادہ ہونی چاہیے جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے

ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے ان الله فرض علينا تعزير رسوله
وتوقيره ونصره ومنعه وتوقيره واجلاله وتعظيمه یعنی حق تعالیٰ نے ہم پر رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر فرض کی ہے اور نیز ابن تیمیہؒ نے اُسمیں لکھا ہے
فقيام المدحة والثناء عليه والتعظيم والتوقير له قيام الدين كله وسقوط
ذالک سقوط الدین كله یعنے مدح و ثنا و تعظیم و توقیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنا
دین کو قایم کرنا ہے اور اس کو ساقط کر دینا دین کو ساقط کر دینا ہے

الحاصل جسطرح محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واجب ہے اسیطرح حضرتؐ کی
تعظیم و توقیر و مدح و ثنا بھی واجب بلکہ فرض ہے۔

اسلام

بحث اسلام کے معنے میں۔

اسلام بمعنی انقیاد و گردن نہادن ہے۔ کما فی لسان العرب الاسلام
والاستسلام الانقياد اور نیز بمعنی تفویض ہے جیسا کہ منتہی الارب میں ہے

اسلم امرہ الی اللہ ای سلم وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلمت نفسی الیک ای فوضت۔

تمہید ابو شکور میں لکھا ہے کہ بعض فقہا ایمان و اسلام میں فرق کرتے ہیں۔ اور شیعہ کا قول بھی یہی ہے وہ کہتے ہیں کہ جو شرایع کو ادا کرے اور علوم تاویل و تنزیل کو نجانے وہ مسلم ہے۔ اور مومن وہ ہے جو حقائق تاویل کو جانتا ہو

معتزلہ کے نزدیک ایمان باطن میں ہے اور اسلام ظاہر میں۔ گناہ کبیرہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے اور اسلام سے نہیں نکلتا اسلئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان اور اسلام میں فرق کیا ہے چنانچہ ایمان کے باب میں فرماتے ہیں ان تومن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسولہ الخ اور اسلام کے باب میں اقامۃ الصلوۃ وایتاء الزکوۃ۔ لیکن عامہ فقہاے اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان۔ اسلام۔ معرفت اور توحید میں اگرچہ باعتبار لغت کے فرق ہے لیکن حقیقۃً کچھ فرق نہیں اسلئے کہ جس میں یہ چاروں صفتیں ہوں وہ مسلمان ہے۔ اور جسمیں ایک صفت بھی نہو وہ کافر ہے انتہی۔

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے الاسلام ھو التسلیم ای باطناً والانقیاد لاوامر اللہ تعالیٰ ای ظاھراً ففی طریق اللغۃ فرق بین الایمان والاسلام ولکن لایکون ایمان بلا اسلام ولا اسلام بلا ایمان فھما کالظھر مع البطن والدین اسم واقع علی الایمان والاسلام والشرائع کلھا۔ یعنے اسلام تسلیم باطنی اور انقیاد ظاہری کا نام ہے اگرچہ باعتبار لغت کے

ان دونوں میں فرق ہے۔ لیکن نہ ایمان بغیر اسلام کے ہو سکتا ہے نہ اسلام بغیر ایمان کے وہ دونوں ایسے ہیں جیسے ظاہر باطن کے ساتھ اور دین کا اطلاق ایمان اور اسلام اور کل شرائع پر ہوتا ہے۔

شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ اسلام دین کے معنی میں مشہور ہو گیا ہے اور لفظ ایمان مسلمان کے فعل قلبی کے نام سے اسی وجہ سے ایمان کے متعلقات بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً خداے تعالیٰ اور انبیا و کتب وغیرہ پر ایمان لانا کما قال لاشتھار لفظ الاسلام فی طریقۃ النبی واعتبار الاضافۃ الیہ حتی صار بمنزلۃ اسم لدین محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلفظ الایمان فی فعل المومن من حیث الاضافۃ الیہ ولم یصر بمنزلۃ الاسم للدین ولھذا کثیرا ما یفتقر فی الایمان الی ذکر المتعلق مثل امنوا باللہ ورسولہ وغیر ذلک بخلاف الاسلام بحث تصدیق و معرفت سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ کفار کو معجزات وغیرہ دلائل سے یقین و اذعان اس امر کا ہو جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں۔ اور قرآن شریف کلام الٰہی ہے۔ مگر استکبار وغیرہ اسباب سے بعض اپنے کفر پر مصر رہتے اور بعض اُس اذعان کی بناپر تصدیق کر کے مشرف باسلام ہو جاتے ہر چند اذعان اور یقین دونوں ایک ہی قسم کے ہوں مگر اہل اسلام تمام موانع کو دفع کر کے زبان اور دل سے اقرار اور تصدیق کرتے ہیں اور انقیاد و فرمان برداری قبول کر کے اپنی ذات کو خدا اور رسول کے تفویض کر دیتے ہیں کہ جسطرح چاہیں اُس میں تصرف کریں اس لئے کہ جن اعضا و قویٰ کے حرکات و سکنات میں انسان کے اختیار کو دخل ہے۔ اُن میں شارع کا تصرف بھی نافذ ہے کہ بعض حرکات و سکنات سے

وہ روک دئے جائیں اور بعض عمل میں لائیں تا معلوم ہو جائے کہ تصرف شرعی کو پوری طور پر قبول کرتے ہیں یا نہیں مثلاً ہاتھ پاؤں سے جو کام متعلق ہیں اُن میں یہ حکم ہے کہ برے کام کے طرف ہاتھ نہ بڑھائیں اور چل کر نہ جائیں زبان کو بدگوئی وغیرہ سے محفوظ رکھیں - علیٰ ہذا القیاس سماعت بصارت شکم - فرج - وغیرہ اعضا کو چند قسم کے افعال و حرکات سے روکنے اور چند افعال کرنے کا حکم ہے - اسی طرح قوائے باطنی مثل خیال وغیرہ کو برے کاموں سے متعلق نہ کرنے اور اچھے کاموں سے متعلق کرنے کا حکم ہے - جنکی تفصیل علم فقہ و اخلاق میں مذکور ہے -

غرضکہ حق تعالیٰ نے انسان کو جن اعضا و قویٰ پر تصرف دیا اُن میں آزمائش کے لئے اپنا بھی تصرف شرعی لگا رکھا ہے - اگر اس تصرف کو قبول نہ کریں تو نافرمانی کا الزام عائد ہوگا جس سے اپنا سراپا اور ظاہر و باطن کو اپنے خالق کے تفویض کر دینا صادق نہ آئیگا حالانکہ اُسکی ضرورت ہے حق تعالیٰ سبحانہ فرماتا ہے - ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ - یعنے اللہ تعالیٰ نے خرید کر لیا ہے مسلمانوں کی جان و مال کو بدلہ میں اسکے کہ اونکے لئے جنت ہے جب مسلمان جان و مال سے بک گئے تو اُنکے تسلیم کر دینے میں کیا تامل -

الحاصل مقتضائے ایمان یہی ہے کہ آدمی اپنی جان و مال خدا و رسول کو تسلیم و تفویض کر دے جس سے اسلام کے پورے معنی صادق آجائیں - یہی وجہ تھی کہ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم - سے کیسی ہی خلاف قیاس بات سنتے فوراً اُسکو تسلیم کر لیتے تھے - اور کیونکر نہ کرتے انکی عقل نے تو ہزار معجزات دیکھ دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ خدائے تعالیٰ کی قدرت ہماری عقول کی پابند نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک

سے آسمانوں پر تشریف لیجانا عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا موسیٰ علیہ السلام کا دریا کو عصا مار کر جدا کر دینا ابراہیم علیہ السلام کے روبرو پرندوں کا زندہ ہونا جنات و ملائکہ کو چھپنے اور ظاہر ہونیکی قدرت عطا ہونا اس جسم سے حشر کے روز اٹھنا وغیرہ امور جو قرآن شریف میں مذکور ہیں اور وہ امور جنکی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے گو معمولی عقل نہ مانے - مگر خدائے تعالیٰ کی قدرت میں کوئی بڑی بات نہیں - الغرض جسکو اسلام کا دعویٰ ہے تو ضرور ہے کہ ظاہر و باطن کے ساتھ عقل کو بھی تسلیم خدا و رسول کر دے ورنہ اسلام کے ساتھ ایمان کو بھی خیرباد کہدینا پڑے گا کیونکہ تقریر بالا سے ظاہر ہے کہ یہ اسلام گویا عین ایمان ہے - اور نیز اس آیہ شریفہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ فی قصۃ ابراہیم علیہ السلام یا بنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تریٰ قال یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین فلما اسلما وتلہ للجبین ونادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا یعنے ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے پیارے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو تم غور کرو کہ کیا مناسب سمجھتے ہو - کہا اے پدر مہربان جو آپ کو حکم ہوا ہے اسکی تعمیل کیجئے مجھے بھی آپ انشاءاللہ تعالیٰ صابروں میں پاؤگے - پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا ابراہیم علیہ السلام نے انکو ماتھے کے بل اور ہمنے انکو پکار کر کہا اے ابراہیم تم نے سچ کر دکھایا اپنا خواب - انتہیٰ -

دیکھئے فلما اسلما باواز بلند کہہ رہا ہے کہ اسلام اسے کہتے ہیں کہ ادھر پدر مشفق اپنے جگر گوشہ کو ذبح کرنے پر مستعد خنجر بکف ہیں اور ادھر ہونہار نوجوان فرزند اپنے نازک گلے کو خنجر براں کے تلے رکھکر کہہ رہے ہیں کہ اے حضرت امتثال

میں دیر نہ کیجئے - اور یہ خیال تک نہیں کہ آخر جرم ہی کیا ہے جسکی سزا دی جا رہی ہے
نہ طبیعت میں یہ خلجان کہ خواب کی باتوں پر تشدد کیا کسی کی معمولی عقل بھی ہرگز قبول
نہیں کر سکتی کہ بے گناہ نوجوان لڑکا یوں ذبح کیا جائے مگر سبحان اللہ کیا اسلام تھا
کہ صاحبزادے نے باوجود استمزاج و مشورہ لینے کے یہ بھی نہ کہا کہ حضرت خواب کے
لئے تعبیر بھی ہوا کرتی ہے جیسے دودھ کی تعبیر علم ہے آخر آپ نے یہی دیکھا کہ ذبح
فرما رہے ہیں یہ ایک واقعہ ہے حکم الٰہی نہیں جس کی تعمیل ضروری ہو - بات یہی
تھی کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام نے قرینۂ گفتگو سے معلوم کر لیا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ
علیہ السّلام کو اس خواب کی بنا پر ذبح کرنا منظور ہے اسلئے نبیؑ کے خلاف مرضی
چون و چرا کرنے کی مجال نہ پا کر اپنے ظاہر و باطن اور عقل کو تسلیم کر دیا -

اب دیکھئے کہ اسلام کیسی چیز ہے کہ جسکے مقابلہ میں جان بھی کوئی چیز نہیں
سمجھی جاتی تھی چنانچہ صحابہؓ کی یہی حالت تھی کہ کیسی کیسی سختیاں اُن پر مخالفین
اسلام ڈالتے تھے -

عرب کی وہ سخت دھوپ جس میں زمین پر پاؤں رکھنا مشکل ہے - ایسی دھوپ
میں گرم پتھر پر برہنہ لٹا کر چھاتی پر پتھر رکھتے اور اقسام کے عذاب دیکر مجبور کرتے تھے کہ
اسلام چھوڑ دیں مگر اُن شیفتگان اسلام پر اُسکا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا - بخلاف اس کے
اس زمانہ میں بعض اُن لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جان و مال کا خطر تو درکنار صرف اِس
احتمال پر کہ مخالفین اسلام کی موافقت میں اپنی دنیوی ترقی ہوگی اور شاید مخالفت
ملت مانع ترقی ہو مخالفین کی ہاں میں ہاں ملادی تاکہ مذہبی تعصب کا الزام جاتا رہے
اور کروڑہا مسلمان قرناً بعد قرن جن اعتقادات پر چلے آ رہے ہیں اور یہ عملدرآمد لاکھوں

کتابوں سے ثابت ہوتا ہے اُسکا کچھ اعتبار نہیں کیا اور تدبیر یہ نکالی کہ فقہ وغیرہ خداو
رسولؐ کا کلام نہ ہونیکی وجہ سے قابل التفات نہیں - رہی حدیث سو وہ متواتر نہ ہونیکی
وجہ سے بیکار ہے البتہ قرآن شریف متواتر ہے مگر اُسکی تفسیر جو مفسرین و محدثین و
سلف نے کی ہے وہ سب ڈھکوسلے ہیں قابل اعتبار وہ تفسیر ہے جو ہم کرتے
ہیں - اب تفسیر کی حالت سنئے - پہلے چند قواعد اپنے مطلب کے تراشے -
منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ جو مضمون قرآن کا خلاف عقل و نیچر ہو اُس میں تاویل
کی ضرورت ہے پھر جو چاہا معنے لکھدیا اور وہ قرآن ہی نہ رکھا جس پر تیرہ سو ۱۳۰۰ برس سے
مسلمانوں کا عملدرآمد تھا اگر سچ پوچھئے تو قطع نظر اعتقادی بات کے اِس نئے قرآن
پر ایمان لانے کی خود ضرورت نہ رہی اسلئے کہ ایمان کی ضرورت تو جب ہو کہ کوئی بات
اُسمیں خلاف عقل ہو جو قائل کے اعتماد پر مان لی جائے - جب سرے سے
کوئی بات بھی ایسی نہیں تو اب ایمان کی ضرورت ہی کیا - یہ تفسیر بلا مبالغہ ایسی
ہے جیسے کافیہ کی شرح اس طرح سے کیجائے قولہ الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد
اقول کلمہ سے کلمہ طیبہ مراد ہے یعنے لا الٰہ الا اللہ جو صرف توحید و تفرید کے واسطے
وضع کیا گیا ہے جسکے معنی مفرد ہیں یعنے ذات بحت جسکا کوئی شریک نہیں قولہ
وھی اسم و فعل و حرف ۰ ۔ اقول ضمیر ہی کلمہ کیطرف راجع ہے لیکن علی
سبیل الاستخدام کلمہ سے مراد یہاں ماسوا اللہ ہے - ماسوی اللہ کو کلمات اسواسطے
کہتے ہیں کہ سب لفظ کن سے پیدا ہو گئے ہیں - ماسوی اللہ تین قسم پر ہیں اسم یعنی
ذات مع الوصف فعل توحید افعالی کے لحاظ سے کل افعال جو عالم میں وجود میں
آتے ہیں افعال الٰہی ہیں فعل کا دوسرا مرتبہ اسلئے ہو کہ افعال کے ناشی صفات ہیں

جو اسم میں ملحوظ ہیں اصطلاحات صوفیہ میں انکی تعریف یہ ہے الصورة المعلومة فی عرصة العلم الالٰهی قبل انصباغها بالوجود العینی کذالک فی کشاف الاصطلاحات پھر حروف دو قسم پر ہیں حروف عالیات وسافلات حروف عالیات شیون ذاتیہ کو کہتے ہیں جو علم غیب میں کامن ہیں جیسے شجرہ نواة میں کما قیل۔ کنا حروفا عالیات لم تقیل متعلقات فی ذرے اعلی القلال۔ چونکہ توحید تین قسم پر ہے توحید ذات جو کلمہ شہادت سے معلوم ہوئی اور توحید صفات جو اسم سے معلوم ہوتی ہے اور توحید افعال جو فعل کا مدلول ہے اس لئے مصنف رح نے تینوں توحیدوں کو علی الترتیب بیان کر کے حروف کو سب کے آخر میں ذکر کیا الخ

اب غور کیجئے اس قسم کی شرح یا تفسیر کو مصنف کی مراد سے کچھ بھی تعلق ہے۔ بیش ازیں نیست کہ طبیعت آزمائی اور دل لگی خوب ہو گی اسیطرح ان تفسیروں کا حال ہے جو اس آخری زمانہ میں اپنی رائے سے لکھی جاتی ہیں۔

الغرض عقل سے خدا و رسول کے کلام کا مقابلہ کرنا اور اپنی عقل کو ترجیح دے کر نصوص قطعیہ کا انکار کر جانا تفویض ہے نہ انقیاد پھر معلوم نہیں کہ اسلام کے کیا معنے لئے جاتے ہیں۔ بہر حال تسلیم و انقیاد مذکورہ بالا کا نام اسلام اور انکا حصول بغیر کامل تصدیق کے ممکن نہیں اسیطرح کامل تصدیق کے بعد وہ دونوں ضرور حاصل ہونگے اس سے یہ بات ثابت ہے کہ ایمان و اسلام میں تلازم ہے۔

یہاں یہ شبہہ کیا جاتا ہے کہ تصدیق صرف اخبار سے متعلق ہے انشائیات میں نہیں ہوا کرتی مثلاً کسی کام کا کسی کو حکم کریں اور وہ تصدیق کر کے کہے کہ آپ سچ کہتے ہیں تو بے موقع سمجھا جائیگا پھر ایمان و اسلام میں تلازم کیونکر ہو جواب اس کا شرح مقاصد میں

لکھا ہے کہ اوامر و نواہی کی تصدیق اس طور پر ہو گی کہ وہ سب حق اور من جانب اللہ ہیں۔ اور اخبار کے منقاد ہونے کی یہ صورت ہے کہ گو وہ خلاف عقل ہوں انکو ماننے اور تسلیم کرنے پر عقل مجبور کیجائے جیسے اعضا اوامر و نواہی کے انقیاد پر مجبور کئے جاتے ہیں

اگر کہا جائے کہ احادیث سے ایمان و اسلام میں فرق ثابت ہے اس لئے کہ شارع علیہ السّلام نے نماز روزہ وغیرہ اعمال جوارح کو اسلام قرار دیا ہے اور ایمان فعل قلبی کو۔

اسکا جواب یہ ہے کہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ منافق کفار سے بھی بدتر ہیں حالانکہ یہ افعال برابر اُن سے صادر ہوتے تھے۔ اُس سے ظاہر ہے کہ صرف اعمال اسلام کے لئے کافی نہیں انقیاد معنوی اس کے لئے ضرور ہے۔ البتہ ایمان و اسلام میں فی الجملہ یہ فرق ہو سکتا ہے کہ اسلام کا بالذات تعلق اکثر افعال جوارح سے ہے اور ایمان صرف فعل قلبی ہے اس مقام میں یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وقالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا یعنی بدوی کہتے ہیں ہم ایمان لائے اُن سے کہئے کہ تم ایمان نہیں لائے یوں کہو کہ اسلام لائے۔ اس سے ثابت ہے کہ دونوں میں تلازم نہیں۔

اسکا جواب یہ ہے کہ اسلام کا لفظ کبھی صلح میں داخل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ لسان العرب میں لکھا ہے چونکہ اُن لوگوں کا اصلی منشا صلح کرنے کا تھا اور برائے نام آمنا کہتے تھے اسلئے ارشاد ہوا کہ تم کو ایمان سے کیا تعلق تم تو صلح میں داخل ہونا چاہتے ہو اسلئے اسلمنا کہو۔ یعنے دخلنا فی الصلح چنانچہ تفسیر درمنثور میں اس آیہ شریفہ کی شان نزول میں لکھا ہے کہ عرب کا ایک قبیلہ حضرتؐ کی خدمت میں آیا

اور مسلمان ہونے کا احسان حضرت پر رکھ کر کہا کہ جیسا فلاں قبیلہ آپ سے لڑا تھا ہم نہ لڑیگے
اِس سے ظاہر ہے کہ انکو صلح مقصود تھی۔ الحاصل منافق پر اسلام کا اطلاق ہونے سے
ثابت ہوتا ہے کہ عرف شرع میں اسلام مرادف یا مساوی ایمان ہے جس سے متبادر
ہے کہ آیۂ موصوفہ میں لفظ اسلام باعتبار عرف شرع مجازی معنی میں مستعمل ہے اور اس آیۂ
شریفہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل اسلام دل سے متعلق ہے قولہ تعالیٰ افمن شرح
اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔

اور اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ عن صفوان ابن امیۃ
عن ابیہ قال استعار منی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درعا من حدید فقلت
مضمونۃ یا رسول اللہ قال مضمونۃ فضاع بعضھا فقال النبی صلی اللہ علیہ
وسلم ان شئت غرمتھا قلت لا لان فی قلبی من الاسلام غیر ما
کان یومئذ رواہ الدار قطنی فی المجتبی۔ یعنی امیہ کہتے ہیں کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فولادی زرہ مجھسے مستعار لی میں نے عرض کی کہ اگر وہ تلف ہو جائے
تو اسکی قیمت عطا ہوگی فرمایا ہاں اتفاقاً وہ تھوڑا تلف ہو گیا حضرت نے فرمایا کہ اگر چاہو تو
اُسکا تاوان دوں میں نے عرض کی کہ اب ضرورت نہیں آج میرے دل میں وہ اسلام
ہے جو اُس روز نتھا۔

الحاصل اصل اسلام بھی مثل ایمان دل ہی سے متعلق ہے۔ مگر چونکہ اقوال و افعال
سے اسلام ظاہر ہوتا ہے اِس لئے جس سے یہ امور صادر ہوں بسبب ظاہر اُس کو
مسلمان کہنا چاہئے۔ چنانچہ امام موفق الدین نے کتاب فضائل امام اعظم رضی اللہ عنہ میں
امام صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ تصدیق کے باب میں تین قسم کے لوگ ہیں بعض وہ

ہیں کہ خدا ے تعالیٰ اور اُسکی طرف سے جو کچھ آیا ہے سب کی تصدیق دل اور زبان سے
کرتے ہیں اور بعض صرف زبان سے تصدیق کرتے ہیں اور بعض صرف دل سے
جو لوگ زبان و دل سے تصدیق کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی مومن ہیں اور
اور لوگوں کے نزدیک بھی۔ اور جو صرف زبان سے تصدیق کرتے ہیں اور دل سے
تکذیب وہ اللہ کے نزدیک کافر اور لوگوں کے نزدیک مومن ہیں اسلئے کہ لوگ نہیں
جانتے کہ دل میں کیا ہے۔ اُنکو چاہئے کہ اقرار شہادت کی وجہ سے اُنکو مومن کہیں
اور دل کا حال معلوم کرنیکی کوشش نکریں اور جو لوگ دل سے تصدیق کرتے ہیں اور
بلحاظ تقیہ زبان سے تکذیب کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک مومن ہیں اور ناواقف شخص کے
پاس کافر انتہی۔ چونکہ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اسلئے عبارت اُسکی نقل نہیں کی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو مسلمان کہنے کے لئے اُسکے دل کی کیفیت معلوم ہونا ضرور
نہیں اگر اسکی ضرورت ہوتی تو کسی کو مسلمان کہنا درست نہوتا جس سے مسلمانوں میں
منافرت بلکہ مخالفت پیدا ہو جاتی اِس لئے شریعت نے حکم دیدیا کہ جس سے اسلام کے
اقوال و افعال صادر ہوں اُسکو مسلمان سمجھ لو۔ اور اُس سے مخالفانہ برتاؤ نہ کرو۔ حق تعالیٰ
فرماتا ہے ولا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا یعنے اگر کوئی تم پر سلام
کرے تو یہ مت کہو تو مومن نہیں اسیطرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی توحید
و رسالت کی گواہی دے اور نماز روزہ وغیرہ ادا کرے تو اُسکے جان و مال سے کوئی
تعرض نہیں۔ الغرض بقرینۂ ظاہر حال اسلام و ایمان باطنی پر حکم کیا جائے گا۔ اسیطرح
اگر کفر پر قرینہ ہو تو بسبب ظاہر کفر کا حکم کیا جائیگا چنانچہ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں
لکھا ہے الایمان والنفاق اصلہ فی القلب وانما الذی یظھر من القول

والفعل دلیل علیه فاذا ظهر شئ یترتب علیه الحکم۔ شرح مقاصد وغیرہ میں لکھا ہے کہ بعض معاصی کو شارع نے عدم تصدیق کے امارات و علامات قرار دیے ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا قرآن شریف کو نجاست میں پھینکدینا بت کو سجدہ کرنا وغیرہ امور انتہیٰ۔ اس سے اہل اسلام سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ قاعدہ قرار دے کہ جو امور قرآن و حدیث میں خلاف عقل ہوں اُن میں تاویل کرنیکی ضرورت ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ مانے جائیں تو ایسے عقیدہ والے کو کیا سمجھنا چاہیے۔

السیف المسلول میں امام تقی الدین نے لکھا ہے کہ اجماع اس امر پر ہو گیا ہے کہ جو مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص شان کرے یا گالی دے اُسکا قتل واجب ہے۔ اور لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صاف حکم دیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یا کسی نبی کو گالی دے۔ اُسکو قتل کرڈالو اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ جو شخص کسی آیت قرآنی کے ساتھ ہزل اور تمسخر کرے وہ کافر ہو جاتا ہے باعتبار ظاہر ایسے شخص کی تکفیر کا حکم دیا جائے۔

ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے قال اصحابنا التعریض بسب اللہ وسب رسولہ صلی اللہ علیه وسلم ردة وھو موجب للقتل۔ و ایضاً قوله قال مالکؒ فی روایة المدنیین عنه من سب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم او شتمه او عابه او تنقصه قتل مسلماً کان او کافراً۔ وایضاً قوله وان یزعم ان زھدہ لم یکن قصداً ولو قدر علی الطیبات لاکلها او اشباہ ھذا قال فهذا الباب کله مما عدہ العلماء سبا او تنقیصا

یجب قتل قائله ولم یختلف فی ذالک متقدمهم ومتاخرهم وایضاً قوله ان الساب ان کان مسلما فانه یکفر و یقتل بغیر خلاف وھو مذھب الائمة الاربع وغیرھم وقد تقدم ممن حکی الاجماع علی ذلک اسحاق بن راھویه وغیرہ۔ ماحصل ان روایات کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے۔ اگرچہ تنقیص شان کنایۃً ہو۔ اگر کوئی کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد قصداً نہ تھا۔ اگر عمدہ چیزیں ملتیں تو آپ کھاتے ایسے شخص کا بھی قتل واجب ہے۔

ان روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر چند کوئی اسلام ظاہر کرے مگر جب قرائن مذکورہ اس میں پائے جائیں تو وہ کافر سمجھا جائیگا اور اسکا یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں یا شعار اسلام اُس سے ظاہر ہوں کچھ مفید نہ ہوگا۔ یہ صرف ایک آیت کے انکار کا نتیجہ تھا کہ حق تعالے فرماتا ہے وتعزروہ وتوقروہ یعنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کرو اب خیال کیا جائے کہ جس کسی کو خدائے تعالیٰ کی قدرت میں کلام ہو کہ وہ عادت کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ اِس قاعدہ سے کتنے آیات قرآنی کا انکار ہوا جاتا ہے کل معجزات انبیائے سابق کا۔ حشر و نشر کا۔ جنت و دوزخ کا۔ جن و ملائک وغیرہ جن کا وجود قرآن شریف سے ثابت ہے جب قرآن کا یہ حال ہو تو حدیث کو کون پوچھے۔ اور جب خدا و رسول پر تہذیبی پیرایہ میں جھوٹ کا الزام لگایا گیا تو صحابہ اور علمائے امت وغیرہم کس قطار و شمار میں پھر باوجود ان تمام انکاروں کے معلوم نہیں کہ اسلام کس چیز کا نام رکھا جاتا ہے۔ ھداناالله وایاھم سواء السبیل اس زمانہ میں مسلمانوں کو اس قدر ضرور ہے کہ ایسی تفسیریں دیکھیں نہ اس

قسم کی تفسیریں نہیں جس سے شک پیدا ہو - بلکہ دعا کریں کہ خدائے تعالیٰ ہمکو اور
انکو ہدایت کرے اور وہ ایمان و اسلام عطا فرما وے جو باعث نجات اخروی ہے

وما توفیقنا الا باللہ۔

یہ بات اوپر معلوم ہوئی کہ ایمان نہ معمولی تصدیق کا نام ہے نہ معرفت کا بلکہ جبتک
دس چیزیں نہوں ایمان کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ کام نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے
مگر خدائے تعالیٰ کی طرف سے شرح صدر ہو جاتا ہے تو پھر کوئی دشواری باقی نہیں
رہتی - چنانچہ بخاری و مسلم کی اس حدیث شریف سے ظاہر ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ
غزوۂ احد میں ایک اعرابی بطور تفریح اس سادگی سے معرکۂ جنگ میں آیا ہاتھ میں کھجوریں
ہیں اور بلا تکلف کھاتے ہوئے تماشا دیکھ رہا تھا کہ یکبارگی دوسرا خیال پیدا ہوا جو باعث
ہدایت تھا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں آپکی طرف سے لڑوں
تو میرا مقام کہاں ہوگا آپ نے فرمایا جنت میں یہ سنتے ہی کھجوریں پھینک کفار
کے لشکر پر حملہ آور ہوا اور داد جوانمردی دیکر مقصود کو پہونچ گیا دیکھئے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے صرف خبر دی کہ اگر ہماری طرف سے لڑ کر مروگے تو جنت میں داخل ہو جاؤگے
نہ کوئی انکو معجزہ دکھلانے کی ضرورت ہوئی نہ مناظرہ کی نوبت آئی صرف ایک ہیچ
اشارہ نے وہ کام کیا کہ فوراً انہوں نے یہ مان لیا کہ عالم کا ایک خالق ہے جس نے
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں صحیح اور اس قابل ہے کہ
اگر اسپر عمل کیا جائے تو سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے اور وہ مقام ملتا ہے جو صرف
راحت اور عیش کیلئے بنایا گیا ہے گو انہوں نے زبان سے کچھ بھی نہیں کہا مگر یہ سب
امور اور تصدیقیں انکی ایک تصدیق میں شامل ہیں۔ پھر صرف تصدیق ہی نہیں بلکہ

طور پر یہ دکھلا دیا کہ ایمان والے خدا اور رسولؐ کے حکم کے بعد نہ اپنی محبوبہ کے بیوہ ہونیکی
پروا کرتے ہیں نہ اولاد کے یتیم ہونیکا خیال بلکہ پروانہ کیطرح جان کو فدا کر دیتے ہیں بخلاف
اسکے بہت سے لوگ عمر بھر معجزے دیکھا کئے اور پوری معرفت حاصل تھی کہ حضرتؐ اللہ کے
رسولؐ ہیں پھر اسپر حضرتؐ نے ترغیبیں بھی دیں کما فی تفسیر ابن جریر وغیرہ اور فرمایا کہ اگر تم
ایک کلمہ کہدوگے یعنی لا الہ الا اللہ تو تمام عرب تمہارا مطیع و منقاد ہو جائیگا۔ اور عجم خراج و جزیہ
تمہیں دینگے۔ اور یہ یقین بھی تھا کہ حضرتؐ کبھی جھوٹ نہیں کہتے باوجود اسکے اس ایک
کلمہ کی تصدیق ان سے نہو سکی اور کہنے لگے اجعل الالہۃ الٰہا واحدا ان ھذا لشیء عجاب
یعنی تمام معبودوں کو ایک بنا دیا یہ عجیب بات ہے۔ انکی درایت گویا یہ کہتی تھی کہ اتنے معبودوں
سے تو کام چل ہی نہیں سکتا پھر ایک معبود اس تمام عالم کا کام کیونکر چلا سکے اور جن لوگوں نے
یہ خیال کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ تو کہتے ہی نہیں اور انکے دعوی رسالت پر معجزات بھی گواہی دے رہے ہیں تو آخر
انکی تصدیق کرنے میں کیا تامل۔ چنانچہ انہوں نے اس ایک کلمہ کی تصدیق کیا اس ایک قسم کی کل باتوں کی تصدیق کرلی
اور آپکے قول کے مقابلہ میں عقل کی ایک نہ مانی اور یہی گروہ یوماً فیوماً ترقی کرنے لگا پھر جب اہل ایمان
کی ترقی دکھلا کر ان پابندانِ عقل و درایت سے کہا کہ تم کیوں نہیں ایمان لاتے تو اسکے جواب
میں انہوں نے کہا وہ لوگ بیوقوف ہیں جو خلاف عقل باتوں کا یقین کر لیتے ہیں کیا
ہم بھی انکی طرح بیوقوف بنیں چنانچہ قرآن شریف سے اسکی تصدیق ہوتی ہے کما قال تعالے
واذا قیل لھم آمنوا کما آمن الناس قالوا انؤمن کما آمن السفہاء غرض انکی درایت نے انکو ایمان سے
روکا۔ اور اس جماعت نے جنکو پابندان درایت کی دانست میں سفلہ و احمق تھی یہاں درجہ ترقی کی
کہ ان عقلا کو اپنا قول واپس لینا پڑا چنانچہ سوائے معدودے چند متعصب لوگوں کے جو ہٹ دھرمی
سے اپنی بات پر اڑے رہے کل عقلا گروہ اہل ایمان میں شامل ہوگئے اور یہانتک نوبت پہنچی کہ

فوج فوج ہوکر ایمان لانے لگے کما قال تعالیٰ ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا
مگر ہر زمانے کے متعصب کفار مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے رہے کہ یہ لوگ خلاف عقل باتوں کو
مانتے ہیں۔ اور ایک مدت سے ایک جماعت اہل اسلام کی اس الزام کے اُٹھانیکی کوشش میں لگی
رہی چنانچہ معتزلہ نے فلسفہ سے مدد لیکر بہت سی آیتوں کی تاویل کر ڈالی اور اُنکو عقل کے مطابق کر دیا
اور قرآن کو ایسا بنا دیا جیسے کافیہ کی شرح مذکور پھر کہ آمد براں مزید کردہ کا مضمون صادق آگیا یہانتک
کہ اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آجکل کے اعتقادات و عملیات کو قرآن و حدیث سے ملا کر دیکھیں تو ہرگز
نہ معلوم ہوگا کہ اُن سے کیا تعلق ہے۔ اور قرآن تو ایسا بنا لیا گیا کہ اب اسپر ایمان لانیکی ضرورت ہی
نہ رہی کیونکہ اسمیں ایسی بات ہی نہ رکھی جس کے ماننے میں معمولی عقل کو تردد ہو اور ایمان کی ضرورت
پڑے مثلاً الم تر کیف میں جو مذکور ہے کہ پرندوں نے بحکم خدائے تعالیٰ ایک لشکر عظیم کو ہلاک کر ڈالا جسکے
ماننے میں عقل کا امتحان ہوتا تھا کہ خدا و رسول کی بات قابل قبول سمجھتی ہے یا نہیں اور عقل کو مجبور و
مقہور کر کے اوسپر ایمان لانیکی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اب اُسکی ضرورت ہی نہ رہی۔ اسلئے اوسکا
یہ مطلب بنا لیا کہ کنکر تھے یا اور کوئی بیماری لشکر میں پھیلی تھی جس سے لوگ ہلاک ہو گئے نہ وہاں
پرندے تھے نہ کنکریاں سرے سے وہ قصہ ہی غلط ہے جس پر قدیم زمانہ اسلام سے آجتک
لوگ ایمان لاتے رہے۔ اگر اُن سے کہا جائے کہ جسطرح تیرا سو سال سے لوگ ایمان
لا رہے ہیں تم بھی ایمان لاؤ تو صاف کہا جائیگا انؤمن کما آمن السفہاء یعنی کیا پرانی
فیشن والوں کی طرح ہم خلاف عقل باتوں کا یقین کرینگے ہرگز نہیں چونکہ آجکل کے محاورہ میں
پرانی فیشن والے احمق سمجھے جاتے ہیں اسلئے سفہاء کے ترجمہ میں وہ لفظ لکھا گیا ہے۔
ہرچند اس لفظ کا صدمہ گالی سے کم نہیں مگر ایک جہت سے ہم لوگونکو خوش بھی ہونا چاہیے اسلئے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو صحابہ کو عقلا نے جو لقب دیا تھا وہ لقب آج ہمکو دیا جا رہا ہے

اور غالباً صحابہ بھی اُس لقب سے ناراض نہوے ہونگے اسلئے کہ سفہا کہنے والوں کی نسبت حق
تعالیٰ نے فرمایا الا انہم ہم السفہاء ولکن لا یعلمون یعنی یاد رہے کہ جاہل انکو
سفہا کہتے ہیں وہی سفہا ہیں لیکن وہ جانتے نہیں۔ دیکھئے اہل ایمان کی کیسی فضیلت ہے کہ خود
حق تعالیٰ نے اُنکو تشفی کیلئے فرمایا کہ جو لوگ تمکو بے وقوف کہتے ہیں درحقیقت وہی بیوقوف
ہیں۔ ظاہرا اس تشفی دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ
سفیہ اور احمق کہنے سے بڑا رنج ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے احمق بلکہ کم عمر لڑکے کو بھی اگر
کہا جائے کہ سفیہ اور احمق ہے تو اسکو رنج ہوتا ہے اور حتی الوسع وہ کوشش کرتا ہے کہ
یہ لفظ اپنی نسبت نہ کہا جائے چنانچہ یہ امر مشاہد ہے کہ پرانی فیشن کا الزام نہ آنیکی غرض سے کیسی
کیسی مصیبتیں اُٹھائی جاتی ہیں اگرچہ نوخیز مشائخین و علماء وغیرہم کا دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنا آبائی
لباس اور وضع ترک کریں مگر اُس ڈر کے مارے کہ کوئی یہ نسمجھے کہ پرانی فیشن والے ہیں مجبوراً
لباس بدل دیتے ہیں اور صرف لباس ہی نہیں بلکہ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اگر کسی
ضرورت کے لحاظ سے ڈاڑھی رکھ بھی لی تو خاص قسم کی قطع و برید کر کے تاکہ پرانے لوگ
سمجھ جائیں کہ کسیطرح منہ پر ڈاڑھی تو ہے اور اسی پر قناعت کرلیں اور نئی روشنی کے لوگ بھی چوں
چرا نہ کرسکیں اسلئے کہ وہ فرنچ فیشن ہے جسکی تقلید بھی روشن خیالی سمجھی جاتی ہے غرضکہ سفہا
کا الزام اہل ایمان کو سخت صدمہ پہونچانیوالا تھا جس سے احتمال تھا کہ وہ شکستہ خاطر ہوکر الزام
اُٹھانیکی فکر کرینگے اسلئے حق تعالیٰ نے اُنکے حوصلے بڑھانے کیلئے فرمایا کہ تم سفہا نہیں ہو بلکہ وہی
سفہا ہیں جو تمکو سفیہ کہتے ہیں اس سے اہل ایمان کو کمال درجہ کا افتخار حاصل ہوگیا کہ سفاہت کو
حق تعالیٰ نے اُنہی لوگوں میں منحصر کر دیا جو ہمیں سفہا کہا کرتے ہیں جیسا کہ انہم ہم السفہاء کی
ترکیب سے ظاہر ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہم عقلا ہیں اسی وجہ سے

ما تقون یا اولی الالباب کا خطاب ہوا کیونکہ خدا سے ڈرنیوالے وہی لوگ ہیں جنکا ایمان کامل ہے
ورنہ خدا کا خوف تو درکنار جن لوگوں پر خوف الٰہی غالب ہوتا ہے اُن سے اس زمانہ میں تمسخر کیا
جاتا ہے اور اُن پر بہتان کئے جاتے ہیں جسطرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی
اہل ایمان کے ساتھ تمسخر کیا جاتا تھا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے زین للذین کفروا الحیوۃ الدنیا
ویسخرون من الذین امنوا والذین اتقوا فوقہم یوم القیمۃ یعنی کافروں کو زندگی دنیا کی اچھی معلوم ہوتی ہے
اور وہ ایمان والوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور جو لوگ متقی ہیں قیامت کے روز اُنکے اوپر ہوں گے
یعنی جنت میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کیساتھ تمسخر کرنا عقلا کا لازمہ ہے اور ہونا
بھی چاہیے اسلئے کہ جب اہل ایمان عقلا کے دانست میں سفیہ اور بیوقوف ٹھرے تو بیوقوفوں کیساتھ
تمسخر کرنیکو خواہ مخواہ آدمی کا جی چاہتا ہے جس سے ایک قسم کا سرور ہوتا ہے اس موقع
میں اہل ایمان کو فراخ حوصلگی سے کام لیکر یہ سمجھنا چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم بحسب وعدہ
الٰہی آخرت میں دائمی عیش و عشرت اور فرحت و سرور میں رہیں گے اگر وہ لوگ چند روزہ دنیا میں
تمسخر سے اپنا دل بہلالیں اور سرور حاصل کریں تو بے موقع نہوگا کیونکہ آخر وہ بھی بندۂ خدا ہیں
کم سے کم اتنا تو چاہیے کہ اس عالم میں ہر طرح سے سرور حاصل کریں۔

اب ہم اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے طفیل سے جمیع اہل اسلام کو ایمان کامل عطا فرماکے دارین میں خائز المرام رکھے آمین یا رب العالمین
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ
اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

بالخیر تمت

اعلان

اہلِ اسلام کو بشارت دی جاتی ہے کہ مجلس اشاعۃ العلوم جامعہ نظامیہ نے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف
فلسفۂ اسلام، تاریخ وسیرت، اخلاق وفضائل، معجزات وکرامات، استعانت، ردِ وہابیت، ردِ قادیانیت، زیارتِ قبور، علم
غیب، طبقات اولیاء، میلاد مبارک، رؤیۃ الٰہی، وحی، عشق ومحبت، سماع موتیٰ، نداء، جوازِ قیام، وسیلہ، معراج مبارک وغیرہ
جیسے اہم مسائل پر مولانا حافظ محمد انوار اللہ فضیلت جنگ علیہ الرحمہ بانی جامعہ نظامیہ ودیگر علماء اعلام کی مدلل عمدہ تصانیف
شائع کی ہیں، جن کا مطالعہ ایمان میں تازگی روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے لہٰذا ان کتابوں کا ہر مسلمان کے پاس رہنا ضروری
ہے چند موجودہ کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:-

مقاصد الاسلام اول تا یازدہم۔ افادۃ الافہام حصہ اول۔ مختارات الادب زیدان بدران (عربی) حقیقۃ الفقہ
حصہ اول ودوم۔ الکلام المرفوع۔ شمیم الانوار۔ خدا کی قدرت۔ مسئلۃ الربوا۔ انوار التمجید۔ نثر المرجان فی رسم
القرآن اول تا ہفتم، روح الایمان، الوسیلۃ العظمیٰ۔ العروۃ الوثقیٰ، ہدایۃ الترتیل اول ودوم، فتاویٰ نظامیہ
اول تا سوم۔ مرجع غیب۔ ثبوت ذکر جہر۔ شعائر اللہ فی فضائل شعر رسول اللہ، مکارم الحفظ، انوار احمدی۔
سلام الاسلام، معجم المصنفین اول تا چہارم۔ القول الاظہر۔ الحجۃ البازغۃ، حمایت الصلوٰۃ اول ودوم۔

اطلاع

مجلس اشاعۃ العلوم کے کام صاحبانِ خیر کے عطایا اور ارکان کی امداد پر چل رہے ہیں علم دوست
اصحاب سے خواہش کی جاتی ہے کہ کم از کم ایک سو روپیے کی رکنیت قبول فرمائیں۔ ادائی یکمشت
یا بالاقساط بھی ہو سکتی ہے، اراکین کو مجلس اشاعۃ العلوم کی مطبوعات اصلی لاگت پر، اور سابقہ مطبوعات ۳۳ فیصد
رعایت کے ساتھ دی جائیں گی۔

اشاعۃ العلوم کی تمام مطبوعات صبح ۱۰ تا ۴ ساعت دن دفتر اشاعۃ العلوم
جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

المعلن

مُحَمَّد خواجہ شَرِیف شیخ الادب

جامعہ نظامیہ ومعتمد مجلس اشاعۃ العلوم، حیدرآباد ۱۰۵۹